جون
۲۰۲۵ء

آپ کا فکری و ادبی ترجمان

ماہنامہ

رازِ حیات

شمارہ ۱

کبھی کبھی لفظوں کی خاک میں وہ چنگاری چھپی ہوتی ہے جو صدیوں کی فکری سردمہری کو جلا دیتی ہے۔
بعض اوقات ایک تحریر، محض جملوں کی ترتیب نہیں بلکہ روح کی تلاطم خیز آہنگ ہوتی ہے؛ رازِ حیات بھی کچھ ایسا ہی ایک مقدس عزم ہے ہی ایسا خواب جو آنکھ سے نہیں، دل کے در پر اترا ہے؛ ایسا مجلہ جو کسی وقتی ولولے کا حاصل نہیں بلکہ شعور و احساس کے دیرینہ اضطراب کا پہلا خوشبو بھرا جواب ہے۔

رازِ حیات محض ایک نام نہیں، یہ ایک عہد ہے ہی ایک عہدِ فکری، جس میں قلم خود کو صرف صفحات کی زینت نہیں، ذہنوں کے محاسب اور روحوں کے مشیر کے طور پر دیکھتا ہے۔ ہم نے جب اس ماہنامہ کا تصور باندھا، تو نگاہیں وقتی پذیرائی کی تمنا سے نہیں، بلکہ اُن دور افتادہ صداؤں کو آواز دینے کی نیت سے اُٹھیں جو دبے الفاظ میں، مگر پرشکوہ مفہوم میں، صدیوں سے ہمارے ذہن کے کسی ویرانے میں گونجتی رہی ہیں۔

شاہد رضا نعمانی مصباحی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بفیض امام الائمہ سراج الامۃ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا فکری وادبی ترجمان

ماہنامہ

رازحیات

شمارہ: ۱ | جون۔ ذی الحجہ ۲۰۲۵ء ۱۴۴۶ھ

مجلس ادارت

مدیر اعلی: شاہد نعمانی مصباحی

نائب مدیر: تطہیر نعمانی مصباحی

تزئین کار: تحمید برکاتی مصباحی

مجلس مشاورت

پیر طریقت علامہ ضیاء المجتبی کامل

مفتی محمد رضا مصباحی

علام مصطفی نعیمی

مولانا غلام ربانی مصباحی

معاونین

مفتی شہر سید صابر مصباحی اندور

مولانا عادل مصباحی

محترم قارئینِ گرامی

آپ کی بصیرت افروز تحریریں اور فکر انگیز مضامین ہمارے ماہنامے کی آبرو اور روح ہیں۔ ہم آپ سے دل کی گہرائیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ آئندہ شمارے کے لیے اپنے قیمتی مقالات اور علمی نگارشات ہمیں ضرور ارسال فرمائیں، تاکہ ہم اس گلزارِ علم کو آپ کے قلم کی خوشبو سے معطر رکھ سکیں۔

نوٹ: آپ ماہنامہ رازحیات ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں اور اپنے مقالات ارسال کرسکتے ہیں۔

Www.Razehayat.com Contact@razehayat.com Phone No:8115717149

نگارشات

کالم	عناوین	محررین	صفحہ
نقش مدیر	ماہنامہ راز حیات	شاہد نعمانی مصباحی	2
کلمات بزرگاں	تاثرات	علامہ عبید اللہ خان اعظمی	3
	دعائیہ کلمات	مولانا مسعود برکاتی مصباحی	4
	دعائیہ کلمات	مفتی نسیم احمد مصباحی	5
آئینۂ زمانہ	مارنے والوں کا مذہب یاد تو بچانے والوں کا کیوں نہیں؟	مفتی غلام مصطفیٰ نعیمی	6
چرخ تصوف	زندگی جیتے کیسے ہیں؟	مفتی محمد عباس ازہری	8
فہم دانش	خصوصی تحریری انٹرویو: علامہ افروز قادری چریاکوٹی	علامہ افروز قادری چریاکوٹی	10
نکہت نسواں	مسلم خواتین، مغربی تہذیب اور اصل جدیدیت	دیا عقیل-پاکستان	24
برگ تبسم	لطیفہ	شاہد نعمانی مصباحی	26
منظومات	حمد باری تعالی	محبوب گوہر اسلام پوری	27
سخن تلاشی	سخن تلاشی	ابو محمد مظہری	28

رازِ حیات

شاہد نعمانی مصباحی.. مدیر اعلی، ماہنامہ راز حیات

کبھی کبھی لفظوں کی خاک میں وہ چنگاری چھپی ہوتی ہے جو صدیوں کی فکری سرد مہری کو جلا دیتی ہے۔ بعض اوقات ایک تحریر، محض جملوں کی ترتیب نہیں بلکہ روح کی تلاطم خیز آہنگ ہوتی ہے؛ رازِ حیات بھی کچھ ایسا ہی ایک مقدس عزم ہے—ایسا خواب جو آنکھ سے نہیں، دل کے در پر اترا ہے؛ ایسا مجلہ جو کسی وقتی ولولے کا حاصل نہیں بلکہ شعور و احساس کے دیرینہ اضطراب کا پہلا خوشبو بھرا جواب ہے۔

رازِ حیات محض ایک نام نہیں، یہ ایک عہد ہے—ایک عہدِ فکری، جس میں قلم خود کو صرف صفحات کی زینت نہیں، ذہنوں کے محاسب اور روحوں کے مشیر کے طور پر دیکھتا ہے۔ ہم نے جب اس ماہنامہ کا تصور باندھا، تو نگاہیں وقتی پذیرائی کی تمنا سے نہیں، بلکہ اُن دور افتادہ صداؤں کو آواز دینے کی نیت سے اُٹھیں جو دبے الفاظ میں، مگر پر شکوہ مفہوم میں، صدیوں سے ہمارے ذہن کے کسی ویرانے میں گونجتی رہی ہیں۔

اس پہلی اشاعت میں ہم نے کوشش کی ہے کہ ادب، فکر، تصوف، تنقید، تحقیق، تاریخ، اور عصری شعور کی ایسی ہم آہنگ لَے تیار ہو جو نہ صرف ذہن کو مہمیز دے بلکہ دل کو بھی گداز عطا کرے۔

یہ وہی مہک ہے جو پرانے کتب خانوں کی گرد آلود کتابوں سے اٹھتی ہے اور وہی گداز ہے جو کسی بزرگ کے نرم لہجے سے نکلے ہوئے حرف میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

ہم اپنے اُن اکابرین اور اہلِ قلم کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس چراغ کی پہلی لو کو ہوا سے بچایا، دعا سے سینچا، اور اپنے قلم کی روشنی سے منور کیا۔

حضرت علامہ عبید اللہ خان اعظمی—جن کی دعائیں ہماری پشت پر مثلِ سائبان ہوئیں۔ اُن کے الفاظ میں وہ روحانی تاثیر ہے جو صرف اہلِ صدق کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کے تحریری دعائیہ کلمات نے ہمارے اس کارواں کو تقدیس کی چادر اوڑھا دی۔

مفتی نسیم مصباحی، استاذِ جامعہ اشرفیہ مبارکپور—جنہوں نے ایک پکار پر لبیک کہا، اور اپنی سخن سنجی، دعا و مشورہ، اور مسلسل توجہ سے یہ احساس دیا کہ ہم تنہا نہیں، علم و عرفان کے مینار ہمارے ساتھ ہیں۔

مولانا مسعود احمد برکاتی۔ جن کی فکری روشنی نے اس رسالے کو توازن، تہذیب اور تہہ داری عطا کی۔

اور علامہ افروز قادری—جنہوں نے سترہ صفحات پر مشتمل طویل انٹرویو کے لیے اپنا قیمتی وقت وقف کر کے ہمیں وہ عظمت بخشی جس کا بیان الفاظ سے باہر ہے۔

مفتی صابر صاحب اندوری کا بھی ہم صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں، جنہوں نے نہ صرف مالی تعاون کیا بلکہ اس رسالے کی پیش رفت کے ہر موڑ پر رفیقِ سفر بن کر کھڑے رہے۔ ان کا اخلاص ہماری ہمت کا ایندھن ثابت ہوا۔

(بقیہ صفحہ:7-پر)

تاثرات

عبید اللہ خان اعظمی، نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دہلی

راز حیات کھول کے پردہ اٹھائیے
ملت کو اپنی بھولا سبق پھر پڑھائیے

عزیز القدر مولانا شاہد نعمان سلمہ

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے زمانہ طالب علمی میں فکر و فن کا ایک نیا سورج راز حیات کے نام سے مطلع تہذیب و تمدن مذہبی اقدار کی بلندی اور قومی و ملی شناخت کے بام پر روشن کرنے جارہے ہیں میری جانب سے اس مثبت سوچ پر آپ اور آپ کے رفقا کو دلی مبارکباد پیش ہے۔ عزیز محترم، آج کے دور کی یہ تلخ سچائی ہے کہ اعلی سے اعلیٰ خیالات لب اظہار تک نہیں پہنچ پاتے اور سینے میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ کتنے بن گاے نغموں گلے گاروں کی آواز میں دھلے بغیر موت کی نیند سو جاتے ہیں، اہل علم و قلم کس قدر دلچسپ قصے، تاریخی حقائق اپنے سینوں میں لے کر دنیا سے رخصت ہو گے، کتنے خوبصورت افکار قرطاس کی زینت بننے سے محروم رہ گے، وہ گراں قدر خیالات کس قدر دل آویز ہوتے اگر تحریر میں آتے، گوش سماعت تک پہنچتے، ان کے آہنگ سے کوئی کلی کھلتی، کوئی ہونٹ مسکراتا، کوئی امید جگاتی، اور تاریکی کو نور کی شعاع ملتی، یہ بات ذہن نشیں رہے کہ نقش وہی باقی رہتا ہے جو کل کے انتظار کے بغیر اظہار صفحات پر آکر اپنے ثبات کو تسلیم کرا سکے، اگر قدرت نے آپ کو فکر کی صلاحیت، اظہار کا سلیقہ اور عمل کا حوصلہ دیا ہے تو مناسب وقت اور سہولتوں کا انتظار نہ کیجیے، جو کہنا ہے کہہ ڈالیے، جو لکھنا ہے لکھ ڈالیے اور جو عمل کرنا ہے اس کی بنیاد ڈال دیجیے، اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہ بھی ہوے تو بھی آپ دوسرے لوگوں کو کچھ کہنے، کرنے کا حوصلہ دے جائیں گے اور یہ حوصلہ بھی آپ کے لے صدقہ جاریہ ہو گا۔

کرنوں سے آس توڑ لے ذروں کو آفتاب کر
صبح کہیں گزر نہ جانے صبح کے انتظار میں

دعائیہ کلمات

برائے اولین اشاعت ماہنامہ "رازِ حیات"

مولانا مسعود احمد برکاتی صاحب

الحمد للہ! یہ جان کر دل کو خوشی ہوئی کہ نوجوانوں کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت فکری اور علمی سلسلہ "رازِ حیات" کی شکل میں سامنے آرہاہے۔ یہ وہ وقت ہے جب سنجیدہ مطالعہ، فکر انگیز تحریریں اور سادہ مگر اثر خیز گفتگو کی سخت ضرورت ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے نوجوان قلمکار اس جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔ رازِ حیات کی پہلی اشاعت کے موقع پر میں تمام منتظمین، معاونین، اور اہلِ قلم کو مبارکباد دیتا ہوں، جنہوں نے اپنے اخلاص اور محنت سے اس سفر کا آغاز کیا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ماہنامہ کو خیر، اخلاص، فہم اور توازن کا امین بنائے۔ یہ رسالہ صرف لفظوں کا مجموعہ نہ ہو بلکہ ایک چراغ بنے جو دلوں کو روشنی دے، ذہنوں کو راہ دکھائے، اور معاشرے میں علم، ادب اور فہم کی فضا پیدا کرے۔

اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، باقی رکھے، اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی رہنمائی کا ذریعہ بنائے۔

محترم قارئینِ گرامی!

آپ کی بصیرت افروز تحریریں اور فکر انگیز مضامین ہمارے ماہنامے کی آبرو اور روح ہیں۔ ہم آپ سے دل کی گہرائیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ آئندہ شمارے کے لیے اپنے قیمتی مقالات اور علمی نگارشات ہمیں ضرور ارسال فرمائیں، تاکہ ہم اس گلزارِ علم کو آپ کے قلم کی خوشبو سے معطر رکھ سکیں۔

شاہد نعمانی مصباحی

مدیر اعلی، ماہنامہ راز حیات

دعائیہ کلمات

مفتی محمد نسیم احمد مصباحی عفی عنہ خادم التدریس والافتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ وعلیٰ آلہ واصحابہ ومن تبعھم بإحسانٍ الیٰ یوم الدین

علم وحکمت کی روشنی کو عام کرنا، خیر وفلاح کے پیغام کو دلوں تک پہنچانا، اور روحانیت و تہذیب کے چراغ روشن کرنا، یہ سب وہ اعمال ہیں جو بندگی کے خاموش آہنگ میں ڈھلے ہوتے ہیں؛ جن کی تاثیر لفظوں سے نہیں، اخلاص سے جنم لیتی ہے، اور جو دلوں میں تبدیلی کے چراغ روشن کرتے ہیں۔

یہ صرف ایک اشاعتی کاوش نہیں، بلکہ قلوب و اذہان کی تطہیر، شعورِ انسانی کی تعمیر، اور معاشرتی اقدار کی تعبیر کا ایک مقدس وسیلہ ہے۔ رازِ حیات کے صفحات وہ آئینے بنیں گے جن میں صرف الفاظ کا عکس نہیں، بلکہ معانی کا نور، فکر کا جمال، اور عرفان کا جمال نمایاں ہوگا۔

ہر عہد کو ایسے مجلات کی ضرورت ہوتی ہے جو زمانے کے شور میں سکوت کی گہرائی پیدا کریں، سطحی مباحث کے درمیان فکری ارتقاء کی راہیں وا کریں، اور مادی تھکن سے چُور انسان کو معنوی سکون کا سہارا عطا کریں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ رازِ حیات اسی مشن کا حامل ہو کر اُفقِ صحافت پر اپنی الگ شناخت قائم کرے گا

میری صمیم قلب سے دعا ہے کہ یہ مجلہ عالمِ اسلام، بالخصوص اردو داں طبقہ میں فکری بیداری، روحانی تطہیر، تہذیبی شائستگی اور علمی اعتدال کا پیام بنے۔ اس کی تحریریں دلوں کو چھوئیں، ذہنوں کو جھنجھوڑیں، اور زندگیوں کو نکھاریں۔

اللہ رب العزت اس کے جملہ محرکین، مدیر محترم، معاونینِ قلم، اور تمام وابستگان کو سلامت رکھے، ان کے ارادوں کو حسنِ تکمیل عطا فرمائے، اور اس بابرکت علمی سفر کو استحکام و قبولیت کی دولتوں سے سرفراز فرمائے۔

اللّٰھم بارك لنا في أعمالنا واجعلها خالصةً لوجهك الكريم، واحشرنا في زمرة العلماء الراشدين وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

والسلام مع الاکرام والاحترام

(بقیہ صفحہ:4-کا)

"رازِ حیات" کا مقصد نہ کسی فرد کی نمائش ہے نہ کسی جماعت کا بیانیہ۔
یہ رسالہ ایک داخلی جہاد ہے، ایک علمی دستک ہے، ایک فکری ندا ہے
جو ہر اس دروازے پر دی جاتی ہے جہاں سوال سانس لیتے ہیں اور جوابات کھو چکے ہیں۔
ہم قاری سے التجا نہیں کرتے کہ وہ ہمیں پڑھے، بلکہ ہم قاری کے اندر کے ساکت مفکر کو آواز دیتے ہیں کہ جاگو، اور ہم سے مکالمہ کرو۔

مارنے والوں کا مذہب یاد تو بچانے والوں کا کیوں نہیں؟

مفتی غلام مصطفیٰ نعیمی قاضی شہر رام نگر نینی تال

کشمیر کے سیاحتی مقام پہلگام میں ہوئے دہشت گردانہ حملے کے بعد بی جے پی کارکنان اور گودی میڈیا مسلسل مسلمانوں اور اسلام کو نشانہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں انٹیلیجنس کی ناکامی یاد ہے نہ حکومت کی لاپرواہی، یاد ہے تو صرف اتنا کہ دہشت گرد مسلمان تھے۔ اسی کو مدا بناتے ہوئے وہی پرانا رٹا رٹایا سوال ہوا میں اچھالا جا رہا ہے کہ؛

"ہر دہشت گرد مسلمان ہی کیوں ہوتا ہے؟"

ایک عام ہندوستانی شہری کی طرح عام مسلمان بھی حالیہ حملے پر تکلیف اور غم محسوس کر رہا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں سے زیادہ اس تکلیف کو شاید ہی کوئی اور محسوس کر سکے، کیوں کہ آئے دن مسلمانوں کو مذہب ہی کی بنیاد پر ماب لنچنگ، معاشی بائیکاٹ اور لوٹ پاٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود حکمراں پارٹی کے کارکنان اور نظریاتی سنگٹھنوں کا کشمیری اور بھارتی مسلمانوں کے خلاف ماحول سازی کرنا صرف اور صرف ان کی اندھی نفرت ہی ہے جسے اس وقت تک چین نہیں پڑتا جب تک مسلمانوں اور اسلام کو دس بیس گالیاں نہ دے دی جائیں۔

بچانے والے بھی مسلمان تھے!!

مشہور کہاوت ہے کہ؛

"مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے"

پہلگام اٹیک میں موصولہ اطلاعات کے مطابق تین سے چار دہشت گرد موجود تھے۔ تقریباً گھنٹے بھر تک وہاں کوئی سیکورٹی دستہ نہیں پہنچا۔ اس درمیان مقامی مسلمانوں نے سیاحوں کی حفاظت کرنے میں جان کی بازی لگا دی، مقامی گائیڈ سید حسین شاہ اسی کوشش میں مارا بھی گیا۔ حملے کے فوراً بعد مقامی مسلمانوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر زخمیوں اور سیاحوں کو ہسپتال اور محفوظ مقامات تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ عادل حسین نامی ایک کشمیری مسلمان نے تقریباً گیارہ افراد کو بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ایک کشمیری گائیڈ ایک سیاح بچے کو کمر پر لاد کر کئی سو میٹر تک پیدل دوڑتا رہا۔ بیسرن وادی سے لیکر اپنے گھروں / مسجدوں تک کے دروازے کھول کر سیاحوں کی جان بچانے میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھی لیکن افسوس دو چار دہشت گردوں کا مذہب تلاشنے والوں کو بچانے والے درجنوں مسلمانوں کا مذہب یاد نہیں رہا۔ مارنے والے انہیں خوب یاد ہیں، لیکن بچانے والے نہیں۔ اگر دہشت گردوں کی بنیاد پر ان کے مذہب کو ٹارگیٹ کیا جا رہا ہے تو بچانے والوں کے مذہب کی تعریف کیوں نہیں؟

اس سوال کا جواب میڈیا کے پاس ہے نہ حکومتی کارکنان کے پاس! سچ تو یہ ہے کہ وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتے کیوں کہ جواب دینے سے ان کے پروپگینڈے کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ لاشوں کی آڑ میں سیاسی فائدہ اٹھانے کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ اس لیے مصیبت کی اس گھڑی میں بھی یہ لوگ جھوٹ اور پروپیگنڈہ چلانے سے باز نہیں آرہے ہیں۔

مشائخ سنجیدگی سے کام لیں!!

میڈیا ایک خاص قسم کا نریٹیو گڑھنے اور پھیلانے میں لگا ہے۔ جذباتیت کے سہارے حکومت اور انٹیلی جنس کی جواب دہی پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش ہے۔ اس لیے دیش بھکتی / انتقام جیسے لفظوں کا سہار لیکر مسلمانوں پر احساس شرمندگی لادنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس لیے مشائخ اور ذمہ دار علما کو چاہیے کہ وہ میڈیائی پروپیگنڈے کا اثر قبول نہ کریں اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ حالیہ حملے کی مذمت کے ساتھ ساتھ اغیار کے مذہبی تعصب اور حکومت کی جواب دہی پر بھی بات کریں۔ گودی میڈیا کی دورخی پالیسی کو بے نقاب کرنے میں کوئی جھجک نہ دکھائیں۔ ہمیں دہشت گردوں سے رتی بھر بھی ہمدردی نہیں۔ جس طرح انہوں نے مذہب کے نام پر قتل عام کیا ہے ویسی ہی قتل و غارت گری گذشتہ دس سالوں سے مسلمان بھی جھیل رہے ہیں۔ آر پی ایف کے جوان چیتن سنگھ نے نام پوچھ کر ہی تین مسلمانوں کو گولی سے اڑادیا تھا۔ پہلو خان، اخلاق احمد، رکبر خان، تبریز انصاری اور حافظ جنید جیسے سیکڑوں مسلمان صرف مذہبی تعصب کی بنیاد پر ہی مارے گیے ہیں۔ مذہبی غنڈوں کی بھیڑ میں ایک بھی شخص انہیں بچانے والا نہیں تھا لیکن پہلگام میں مقامی مسلمانوں نے سیاحوں کی جان بچانے کے لیے دہشت گردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان کی قربانی تک دی ہے۔ ان حقائق کو ٹھوس اور سنجیدہ انداز میں پیش کریں۔ نپے تلے انداز میں بات کریں۔ مرعوب نہ ہوں اور پلوامہ اٹیک کی طرح جذباتیت میں بہہ کر جگ ہنسائی کا سامان نہ بنیں۔ مسلمان ہر طرح کی دہشت گردی کے خلاف ہیں لیکن دہشت گردی کے نام پر پچیس کروڑ مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

زندگی جیتے کیسے ہیں؟

محمد عباس الازہری خادم التدریس دارالعلوم اہل سنت فیض النبی کپتان گنج، بستی، یوپی۔

کچھ لوگ دنیا میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، لیکن ان کی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں ہوتا، دلوں میں کوئی تڑپ نہیں ہوتی، اور قدموں میں کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ سانس تو لیتے ہیں، مگر جیتے نہیں۔ زندگی کا راز محض سانس لینے میں نہیں، بلکہ کسی مقصد کے ساتھ سانس لینے میں ہے۔ جس زندگی میں کوئی درد نہ ہو، کوئی محبت نہ ہو، کوئی جستجو نہ ہو، وہ زندگی نہیں، محض ایک حیاتیاتی بوجھ ہے۔

کہتے ہیں، ایک مسافر ریگستان کی بے رحم دوپہروں میں بھٹک گیا تھا۔ پیاس نے اس کے ہونٹوں کو سوکھا دیا تھا، دھوپ نے اس کی آنکھوں کی بینائی چھین لی تھی۔ ایک نخلستان کی امید اسے قدم اٹھانے پر مجبور کرتی رہی۔ تھک کر وہ گر پڑا، مگر دل نے کہا: "ابھی نہیں!" وہ پھر اٹھا اور ایک دن نخلستان کے سبز سائے میں جا پہنچا۔ یہی ہے زندگی: گر کر سنبھلنا، تھک کر چلنا، اور ناامیدی کے صحرا میں امید کے چشمے تلاش کرنا۔

ایک دن ایک درویش سے پوچھا گیا: "جینا کیسے چاہیے؟" درویش مسکرایا، اس نے ہاتھ میں ایک چراغ لیا، اسے روشن کیا اور خاموشی سے چل پڑا۔ لوگ حیرت سے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ کچھ دور جا کر درویش نے چراغ ایک اجڑے مکان کی دہلیز پر رکھ دیا اور کہا: "جینا یہ ہے کہ جہاں اندھیرا ہو، وہاں چراغ لے کر جانا!" کتنی سادہ، مگر کتنی گہری بات کہی گئی! زندگی وہ نہیں جو صرف اپنے لیے جیئے، زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لیے روشنی کرے۔

علماء نے لکھا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں: ایک وہ جو وقت کے دھارے پر بہتے ہیں، اور دوسرے وہ جو وقت کا دھارا موڑ دیتے ہیں۔ جینے والے وہی ہیں جو وقت کی بے رحم موجوں میں اپنی کشتی کو سنبھالتے ہیں، اپنی منزل خود متعین کرتے ہیں۔ زندگی کی اصل روح "مقصد" ہے؛ وہ مقصد جو انسان کو اپنی ذات کی تنگ گلیوں سے نکال کر کائنات کی وسعتوں تک پہنچا دے۔

ایک استاد اپنے شاگردوں کو زندگی کا مفہوم سمجھا رہا تھا۔ اس نے ایک خالی کمرہ دکھایا اور پوچھا: "یہ کمرہ کیسا ہے؟" شاگرد بولے: "خالی ہے۔" استاد نے مسکرا کر ایک دیا جلایا اور کہا: "اب یہ کمرہ خالی نہیں رہا۔ روشنی نے اسے بھر دیا ہے۔" پھر کہا: "ایسے ہی تمہاری زندگیاں ہیں۔ اگر علم، محبت اور عمل کے دیے نہ جلاؤ گے تو تم اندر سے خالی رہو گے، خواہ دنیا کے خزانے تمہارے قدموں میں کیوں نہ پڑے ہوں!"

بچپن میں ایک کہانی سنی تھی کہ ایک کسان روزانہ دریا سے پانی بھر کر اپنے کھیتوں میں لے جاتا تھا۔ اس کا ایک مٹکا تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا، اس سے پانی رستا رہتا تھا۔ کسان ہر روز دو مٹکوں کو بھر کر لاتا، مگر ایک مٹکا آدھا راستے میں خالی ہو جاتا۔ سالوں بعد ٹوٹے مٹکے نے شرمندگی سے کہا: "میں شرمندہ ہوں کہ میں تمہاری محنت کا آدھا پانی ضائع کر دیتا ہوں۔" کسان مسکرایا اور بولا: "کیا تم نے راستے میں اپنے جانب پھولوں کو نہیں دیکھا؟ میں نے تمہاری دراڑوں کو جان کر راستے کے کنارے پھول بو دیے تھے۔ تمہارے رستے ہوئے پانی نے ان پھولوں کو زندگی دی۔" ایسے ہی

ہماری زندگی کے زخم بھی کسی اور کے لیے پھول بن سکتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت "قناعت" ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا: "دولت مند وہ نہیں جو خزانے رکھتا ہو، بلکہ دولت مند وہ ہے جو اپنے دل کو حرص سے آزاد کر لے۔" زندگی جیتی ہے وہ روح جو قناعت کو اپنا لباس اور صبر کو اپنا زادِ سفر بنا لے۔ جو لوگ دنیا کی چمک دمک کے پیچھے بھاگتے ہیں، وہ اکثر اپنی روحوں کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک بوڑھی عورت روزانہ اپنے جھونپڑے کے سامنے پانی کا ایک مٹکا رکھتی تھی اور آنے جانے والوں کو پانی پلاتی تھی۔ کسی نے پوچھا: "تم اس سے کیا پاتی ہو؟" وہ ہنس کر بولی: "میرے حصے کی خوشی پانی کے ساتھ بہتی ہے، اور جو دلوں میں گھر کر جائے، وہ زمین پر بھی زندہ رہتا ہے اور آسمان پر بھی!"

مولانا رومی نے کہا تھا: "تو اگر مٹی ہے تو مٹی میں خوشبو پیدا کر؛ تو اگر قطرہ ہے تو سمندر کا خواب دیکھ؛ تو اگر شرارہ ہے تو آتشِ عشق بن جا۔"

زندگی وہ نہیں جو دوسروں کی تقلید میں گزرے، زندگی وہ ہے جو اپنے اندر روشنی، اپنی راہوں میں خوشبو، اور اپنی یادوں میں خوشحالی چھوڑ دے۔ ہم جب دوسروں کے خواب جیتے ہیں تو اپنی حقیقت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اصل جیت تو یہ ہے کہ ہم اپنے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جو پرندہ اپنی اڑان بھول جائے، وہ ہوا کے تھپیڑوں میں رُل جاتا ہے؛ جو انسان اپنی پہچان کھو دے، وہ دنیا کے ہجوم میں بے نام ہو جاتا ہے۔ زندگی تب جیتی ہے جب انسان اپنے دل کی آواز سنتا ہے، اپنے ضمیر کی روشنی میں راستہ چنتا ہے، اور اپنے مقصد کو اپنی عبادت بنا لیتا ہے۔ زندگی اتنی طویل نہیں کہ اسے رنج، حسد، نفرت اور حرص میں ضائع کیا جائے۔ جو لوگ دوسروں کے کینے میں اپنی صبحیں جلاتے ہیں اور اپنی شامیں جلتے ہیں، وہ کبھی زندگی کو جیتے نہیں۔ جینا یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو اتنا وسیع کر لے کہ اس میں سب کے لیے دعا ہو، سب کے لیے خیر ہو۔

برصغیر کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے تھے: "آؤ! ایسا دل بنا لو جو ہر دکھتی آنکھ کا سہارا ہو، ایسا ہاتھ بنا لو جو تھکے قدموں کا عصا ہو، ایسی زبان بنا لو جو زخمی دلوں کے لیے مرہم ہو۔ تب جا کر تم کہہ سکو گے کہ ہم نے زندگی جی ہے۔"

اور سچ یہ ہے کہ زندگی جیتے وہ ہیں جو دوسروں کی زندگی سنوارنے میں اپنے دن کا اجالا، اپنی رات کی تاریکی، اور اپنے دل کی دھڑکنیں لٹا دیتے ہیں۔ جو اپنے لیے جیتے ہیں، ان کا چراغ چند لمحوں میں بجھ جاتا ہے۔ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں، ان کا نور زمانوں کو منور کرتا ہے۔

زندگی کا حسن جدوجہد میں ہے، شکست کھانے کے بعد مسکرانے میں ہے، اور اندھیروں میں اپنے دل کا دیا جلانے میں ہے۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ گر کر بھی دوبارہ کھڑا ہو جاؤ، رو کر بھی ہنسنا سیکھو، اور اجاڑ راستوں پر بھی پھول بونا نہ بھولو۔

سانس لینا تو سب کو آتا ہے، مگر زندگی جیتے وہ ہیں جو ہر سانس میں شکر کی خوشبو بھرتے ہیں، ہر لمحے میں محبت کی روشنی پھیلاتے ہیں، اور ہر قدم پر امید کے بیج بوتے ہیں۔

جینا ہے تو جاگ کر جیو، دل کی آنکھوں کو کھول کر، عقل کی مشعلوں کو روشن کر کے، اور محبت کی خوشبو سے راستے کو معطر کر کے۔ یہی زندگی ہے۔ یہی جیت ہے۔

خصوصی انٹرویو: مولانا محمد افروز قادری چریاکوٹی

انٹرویور: شاہد نعمانی مصباحی

ابتدائی تعارف

مولانا محمد افروز قادری چریاکوٹی اُن اہلِ علم میں سے ہیں جن کے قلم میں علم کی روشنی، تحقیق کی گہرائی، اور فکر کی وسعت نظر آتی ہے۔ ان کی تصانیف میں دین کی بصیرت بھی ہے اور زمانے کا شعور بھی۔ ایسے علما کی ضرورت ہر دور کو رہتی ہے جو علم کو فقط روایتی سانچوں میں نہ دیکھیں بلکہ اس کی روح کو بھی سمجھیں اور پھر دوسروں کو سمجھانے کا مومنانہ جتن فرمائیں۔

سوانحی پس منظر اور فکری ارتقاء

1. حضرت! سب سے پہلے ہم آپ سے یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ کے علمی سفر کا آغاز کہاں سے ہوا؟

میرا علمی سفر اپنے تاریخی و معروف خطے دارالعلم چریاکوٹ کے ایک نامور مدرسہ "دارالعلوم قادریہ" اور ایک ہمہ جہت شخصیت مفکر اسلام علامہ محمد عبدالمبین نعمانی قادری دامت فیوضہم کی سرپرستی و نگہداشت سے شروع ہوا، پھر جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی، شبلی کالج اعظم گڑھ، اور مرکز الثقافۃ السنیۃ کیرالا جیسے اداروں سے جرعہ ٔفیض و نور لیتا رہا، ہنوز سلسلۂ تعلیم جاری ہے، کبھی فارغ عن التحصیل نہیں ہوا، کوشش ہوتی ہے کہ خود کو فارغ للتحصیل رکھوں؛ کیوں کہ تاحیات طالب علم بنے رہنے ہی میں خیر و امان ہے، اور یہی ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کا فرمان عظمت نشان سے بھی مستفاد ہے: **من ظن أنه يستغني عن التعليم فليبك على نفسه**۔ یعنی جو شخص زندگی کے کسی موڑ پر خود کو فارغ عن التحصیل سمجھ لے، تو مانو اب اس کے لیے نوحہ و ماتم کا در وا ہو چکا ہے!۔

ساتھ ہی ایک دردِ دل بھی سن لیں کہ درس نظامی کی تکمیل پر طلبہ ٔمدارس کو جب "فارغ التحصیل" کا خطاب دیا جاتا ہے یا بچے خود کو فارغ التحصیل کہتے ہیں تو میں ڈر سا جاتا ہوں کہ کہیں یہ طلبہ خود کو تحصیل ہی سے فارغ نہ سمجھ بیٹھیں؛ کیوں کہ انھیں درحقیقت تحصیل سے فراغت نہیں ملی ہے بلکہ درسِ نظامی کی تکمیل کا بس ایک پڑاؤ پورا ہوا ہے، جہاں انھیں علوم و فنون کے اُصول و فروع سے آشنا کر دیا گیا ہے، اب اسی پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا یہ فرہادانِ علم کا کام نہیں بلکہ ان کی روشنی میں انھیں تحصیل مزید کے کمربستہ ہو جانا ہے، اور یہ تحصیل مستند تدریس پر بیٹھ کر بھی جاری رکھی جا سکتی ہے اور مزید تعلیمی سفر کے دوران بھی۔ لیکن پھر جب میں نو فارغ طلبہ کو لایعنی و عبث کاموں میں سرگرداں، حال و مستقبل سے بے پروا اور سوشل میڈیا کی بے ہنگم سرگرمیوں میں ملوث دیکھتا ہوں تو میرا وہ ڈر یقین میں بدل جاتا ہے کہ واقعی بچے اب "فارغ" ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس خطاب پہ غور ہونا چاہیے یا اس کی حکیمانہ تشریح طلبہ کے حاشیہ ذہن میں بٹھا دینا چاہیے۔

ویسے بھی ایک مومن کی زندگی میں کوئی لمحہ "فراغت" کا نہیں ہوتا۔ یہ بات استشہاداً قرآنی آیت **فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ** سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ صاحب لولاک پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے لیے کہا جا رہا ہے کہ جب آپ دعوت و تبلیغ کے کاز سے فارغ ہو جایا کریں تو یکسو ہو کر اپنے رب کی یاد میں لگ جایا کریں۔

گویا اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے لیے کوئی فراغت نہیں ہے بلکہ مردِ مومن کی زندگی "جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی" کی آئینہ دار ہونی چاہیے۔

غالباً قاضی شریح الکندی کا واقعہ ہے جو پہلی صدی کے بزرگ ہوئے ہیں کہ عید کے دن وہ کچھ نوجوانوں کے پاس سے گزرے جو بے تحاشا کھیل کود میں مگن تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرکے بیکار وقت ضائع کر رہے تھے۔ آپ نے تعجب سے پوچھا: تم لوگ کب سے کھیل رہے ہو؟ اور سارا وقت اُچھل کود میں کیوں گنوا رہے ہو؟۔ بولے! آپ کو پتا نہیں، آج عید کا دن ہے، 'فارغ' تھے، کوئی کام نہ تھا تو سوچا کہ کچھ کھیل کود ہی کرلیں، خالی وقت کسی نہ کسی طور تو گزارنا ہی ہے!۔ ان کا یہ جواب سن کر آپ نے اظہارِ تاسف کرتے ہوئے بڑی پیاری بات فرمائی کہ کیا فارغ وقت ایسے ہی گزارا جاتا ہے۔ یاد رکھنا مسلمانوں کی زندگی میں کوئی فراغت کا دن نہیں ہے اور پھر اسلام نے خالی وقت گزارنے کا جو تصور دیا ہے وہ تو کچھ اور ہی ہے!، پھر آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی :فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ۔

2. کیا آپ کے خاندان یا علاقے میں علم و تحقیق کی کوئی خاص روایت موجود تھی جس نے آپ کو تحریک دی؟ نیز

تحقیق اور تصنیف کی طرف آپ کے رجحان نے کیسے جنم لیا؟ کیا کوئی خاص واقعہ یا شخصیت تھی جس نے آپ کو متاثر کیا؟

جی بحمد اللہ! میرا مردم خیز اور معارف پرور علاقہ چریاکوٹ صدیوں سے منبع فضل و دانش، گہوارۂ علوم و فنون اور رشکِ یونان و روما رہا ہے۔ کوئی سات صدیوں تک بلا انقطاع اساطینِ چریاکوٹ نے زلفِ علم و کمال کی مشاطگی کا ذمہ دارانہ فریضہ انجام دیا ہے اور ان کے نصاب و تدریس کی بوقلمونیت کے باعث دیار و امصار کے علمی و فکری بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ غرضیکہ اس سرزمین نے جن شخصیتوں کو جنم دیا اور اس خاکِ علم پرور نے جن افراد کی پرورش کی، وہ آسمانِ علم و دانش کے درخشاں ستارے بن کر چمکے اور ان کا طائر شہرت فضائے بسیط کی انتہائی رفعتوں پر پہنچا۔ ملک و ملت کی نامور شخصیات اس خطے کی قصیدہ گو رہی ہیں جن میں بیرسٹر سر آفتاب احمد خان [وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی]، سید سر راس مسعود [وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی]، شاعر مشرق، قلندرِ لاہوری علامہ ڈاکٹر اِقبال، مجاہد آزادی مولوی اِقبال احمد خان سہیل اعظمی، شیخ محمد اِکرام اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اَیوب قادری، پاکستان وغیرہ کو بطور خاص پیش کیا جاسکتا ہے۔

یوں ہی خوانِ چریاکوٹ سے خوشہ چینی کرنے والے مشاہیر کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، صرف علامہ فاروق چریاکوٹی سے شرفِ تلمذ و استفادہ رکھنے والوں میں سے بعض کے اسمایہ ہیں: علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی (لکھنوی)، مولانا جواد بہاری، اکبر الہ آبادی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا جمال الدین افغانی، جسٹس محمود احمد بن سر سید احمد خان، جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، جسٹس سر سید عبد الرؤف، مولانا عظمت اللہ فرنگی محلی، مولانا عزت اللہ فرنگی محلی، شاہ سلیمان پھلواروی، عبد الوہاب بہاری منطقی، مولانا عثمان فلسفی، مولانا احمد حسن کان پوری، علامہ اقبال سہیل، اور آزادی کے بطل جلیل ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ۔

میرے خاندان میں تو کوئی ایسا علمی غلغلہ نہیں رہا ہے،

گویا میں ایک خزاں دیدہ اور ناآشنائے بہار خانوادے کا خزف ریزہ ہوں، تاہم عہد صبا ہی سے خطے کی علمی عظمت و تفوق کے نشان ذہن و فکر پر نقش تھے اور اس کی مٹتی ہوئی تاریخ کے احیا کا عزم دل میں رکھتا تھا، والدین نے بھی جب میرے رجحان کو دیکھا تو مجھے راہِ علم کا مسافر بنادیا، اور پھر میں بے تکان جادہ پیمائی کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا کہ بحمد اللہ چریاکوٹ اور علمائے چریاکوٹ کی ایک مبسوط و مستند تاریخ قلم بند کرنے میں کامیاب ہوا، ہر چند کہ وہ ابھی نامطبوع ہے؛ تاہم عہدِ طفولیت کے دیکھے ہوئے خواب کی یوں تعبیر پاکر یک گونہ خوشی کے احساس سے دل جھوم جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ ایک بہت بڑا علمی و تحقیقی قرض و فرض تھا جس کی توفیق مجھ کم سواد کو ارزانی ہوئی۔ بہر حال! یہی داخلی تحریک میرے لیے تحصیل علم کا باعث اور وسیلۂ تعلیم و تحقیق بنی۔

4. پہلی کتاب لکھنے کا تجربہ کیسا رہا؟ اور اس وقت آپ کے ذہن میں کیا خواب تھے؟

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ خطہ چریاکوٹ سے اٹھنے کے باعث علم و تحقیق تو گویا فقیر کے خمیر میں پڑے ہوئے تھے۔ اولین تصنیف کا معاملہ یہ بنا کہ غالباً ۲۰۰۰ء میں جامعہ امام احمد رضا، رتناگیری، کوکن میں ایک استاد کی ضرورت تھی، تو مرشد گرامی حضرت علامہ محمد عبد المبین نعمانی صاحب کی تحریک پر میں تدریس کے لیے وہاں پہنچا۔ حسن اتفاق کہ تدریس کے لیے میری یہ پوسٹنگ بھی اولین ہی تھی، اور پھر میرے دوایک دوست بھی وہاں مسند تدریس سنبھالے ہوئے تھے، یوں ایک اچھا ماحول مجھے پہلے دن ہی سے میسر آیا۔

امر واقعہ یہ ہوا کہ وہاں جامعہ کے اطراف میں غیروں کا خاصا تسلط ہے اور ان کے بڑے بڑے مدارس بیرونی فنڈنگ پر خوب پھل پھول رہے ہیں۔ وہ لوگ اعلیٰ حضرت کے اعلیٰ درجے کے گستاخ اور عقائد و معمولاتِ اہل سنت کے ٹھیک اُلٹ تھے اور فطرت کا یہ اصول ہے کہ جب بے باکانہ جسارت اور گستاخانہ جرثومے کسی کے اندر جڑ پکڑ لیں تو بات کافی آگے تک جا پہنچتی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان کے ایک مولوی نے ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں اپنے ایک کتابچے کے اندر بڑا گھٹیا قسم کا الزام لگایا بلکہ وہی منافقین مدینہ کی بولی دہرائی، جس نے نہ صرف جماعت صحابہ بلکہ سید کائنات ﷺ کے قلب اطہر کو بھی زخمی کر دیا تھا۔

تو اس کے جواب کے لیے مجھے میدان میں اترنا پڑا اور میں نے کم عمری ہی میں اولین کتاب ”چند لمحے اُم المومنین کی آغوش میں“ تصنیف کی، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے محاسن و مفاخر و محامد کے ساتھ مسئلہ افک کی توجیہ و توضیح قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بحمد اللہ یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا اور پھر مجھے بھی اندر سے قوت ملی، تصنیفی اعتماد بحال ہوا اور فیضانِ قلم کی ایسی برکتیں نصیب ہوئیں کہ آج تک وہ سلسلۂ فیض و نور اللہ و رسول کی عنایتوں سے رواں دواں ہے۔

تحقیق، تصنیف اور علمی نظریات

5. آپ کے نزدیک تحقیق کی اصل روح کیا ہے؟ نیز حوالہ جات کی بہتات اور فہم کی گہرائی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

محققین نے حقائق کی بازیافت کو مقاصد تحقیق میں سر فہرست رکھا ہے۔ گویا تحقیق حقائق کا انکشاف کرتی ہے اور نئی نئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ نیز تحقیق انسانی ذہن کو تلاش و جستجو کے نئے نئے گوشوں سے بھی

ہمکنار کرتی ہے جس کی برکت سے علم و فن کی نئی راہیں کھل کر سامنے آتی ہیں؛ گویا تحقیق کا مقصد صرف جوابات تلاش کرنا ہی نہیں، بلکہ سوالات کی بنیاد پر نیا فہم یا نظریہ تشکیل دینا بھی ہے۔ یوں خلاصۃً کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کی اصل روح انسان کے تجسس، علم کی جستجو اور حقیقت کی بہتر تفہیم میں مضمر ہوتی ہے۔

حوالہ جات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے؛ تاہم اس کی بہتات سے قارئین پر رعب طاری کرنا قرین انصاف نہیں، جیسا کہ آجکل عموما نو آموز قلم کاروں کے نوشتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حوالہ جات کی بہتات سے بات نہیں بنتی بلکہ حوالہ جات کا پایۂ استناد دیکھا جاتا ہے۔ بسا اوقات کوئی ایک حوالہ ایسا جاندار ہوتا ہے کہ وہ درجنوں حوالوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور کبھی درجنوں حوالے بھی کسی مقدمے کی ثقاہت کا بھرم نہیں رکھ پاتے!۔

جہاں تک بات فہم کی گہرائی کی ہے تو اس کا اپنا ہی ایک لیول ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جسے اس بحر کی شناوری نصیبب ہو جاتی ہے اس پر حقائق کے بند در وا کر دیے جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے معارف وبصائر سے صدیوں کے نصیب جگا جاتا ہے۔ جنھیں فہم و فراست کا نور عطا کیا گیا تھا آج ان کے افکار سے زمانے روشنی کشید کر رہے ہیں اور نامعلوم منزلوں کا سراغ پا رہے ہیں۔ فہم کی گہرائی کی عکاسی ڈاکٹر اقبال کے اس مصرع سے مترشح ہے

ع: موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں۔

6. آپ کی کون سی تصنیف آپ کے دل کے سب سے قریب ہے اور کیوں؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ مصنف کی کتابیں اس کی اپنی اولاد کی مانند ہوتی ہیں۔ عربی کا مشہور محاورہ ہے: **تصانیف المصنف أولاده المخلد**۔ یعنی ایک مصنف کی کتابیں اس کی ہمیشہ ہمیش باقی رہنے والی اولاد کی مانند ہوتی ہیں۔ کیوں کہ جسمانی اولاد سے تو بمشکل دو چند پشتوں تک ہی نام چل پاتا ہے، پھر سب نسیاً منسیا اور ہباءً منثورا ہو کر رہ جاتا ہے، جب کہ کتابیں مصنف کے نام و کام کو ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کر جاتی ہیں۔ خاقانیِ ہند جناب ابراہیم ذوق دہلوی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت۔

یہاں آپ 'سخن' کی جگہ 'کتب' بھی پڑھ سکتے ہیں۔ وزن بھی سلامت اور بات بھی با کرامت!۔

تو بات یہ چل رہی تھی کہ مصنف کی کتابیں اس کی اولاد کی مانند ہوتی ہیں اور کسی بھی منصف باپ کے لیے اپنی اولاد کے درمیان تفریق روا نہیں!۔ اس لیے آپ کے اس سوال نے میرے فیصلے کے ریشم کو الجھا کر رکھ دیا ہے کہ اپنی تصانیف میں سے "میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں"۔ بہر حال! میں نے ہر کتاب دل سے لکھی ہے، دل کی آواز پر لکھی ہے اور ملت کا دردِ دل کو محسوس کرتے ہوئے لکھی ہے؛ اسی لیے میری تحریروں میں کچھ آپ کو دلگیر سی لگیں گی، کچھ دل آویز محسوس ہوں گی اور کچھ دل سوز نظر آئیں گی۔ تاہم حالیہ دنوں شائع شدہ کتاب قاموس الخواتین اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے نہ صرف میرے بلکہ بہتوں کے دل سے قریب ہے؛ حتیٰ کہ اس نے اپنوں سے زیادہ غیروں کے دل میں جگہ بنایا ہے اور انھوں نے اپنے تحریری تبصرہ وتاثرات میں اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف وانکشاف بھی کیا ہے۔

7. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ برصغیر میں دینی تحقیق اب بھی تقلید میں جکڑی ہوئی ہے یا نئے افق کھل رہے ہیں؟

دینی تحقیق میں تقلید ہی چلتی ہے؛ کیوں کہ ہم

مقلدانہ روایتوں کے امین ہیں۔ مجتہدین اسلام کے ذریعہ پہلے سے متعین فقہی آرا اور کلامی نظریات سے بلاوجہ روگردانی ہمارے لیے روا نہیں۔ہاں حالاتِ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے خیر خواہی امت کے جذبے کے تحت بعض مسائل میں سہولیات و مراعات فراہم کرنے کا عمل ہر دور کے محققین اسلام نے انجام دیا ہے۔

تاہم دینی تحقیق کے نام پر نئے افق کی بازیافت کرنے والے جدیدیت کے بعض علم برداروں سے اللہ کی پناہ، جنھوں نے دین کو بازیچہ اطفال بنا رکھا ہے اور ان کے انتاجات کو دیکھنے کے بعد لگتا ہے کہ وہ دین کے مبادیات سے بھی نا آشنا ہیں اور اپنے فرسودہ افکار سے اسلام کی شبیہ کو بگاڑنے کی سعی مذموم کیے جا رہے ہیں۔

لیکن اگر اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ دینی کتب و تحقیق کو نئی تب و تاب کے ساتھ پیش کرنا اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی، تو معاف کیجیے گا کہ اس حوالے سے ہمارے یہاں ٹھیک ٹھاک جمود ہے؛ تاہم ہندستان کے مقابلے میں ہمسائے ملک نے اس تعلق سے خاصی کروٹ لی ہے، اور جدید تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے اس نے نئے نئے آفاق کی تسخیر کی ہے۔ بہت سی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کا طریقہ کار ہم سے کافی مختلف ہے، اور وہاں آج بھی مصنفین و محققین کی شاندار مالی و معاشی سرپرستی کی جاتی ہے اور پورے طور پر انھیں فارغ البال کر کے تحقیق و تصنیف کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، جس سے نتیجے میں معرکۃ الآرا کتابیں اور مجلدات پر مشتمل علمی و تحقیقی کارنامے منصہ شہود پر جلوہ بار ہوتے ہیں۔ بلکہ چند سال قبل میں نے "تقسیم وطن کے بعد ہند و پاک میں علمی و تحقیقی کاموں کا تناسب" کے عنوان سے فنون وار ایک تفصیلی مضمون بھی لکھا تھا، جس میں بہت سے تلخ حقائق کا انکشاف کیا گیا تھا، لیکن کسی مصلحت سے انھیں طباعت کی راہ سے میں نے نہیں گزارا۔

8. کسی موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے آپ کن اصولوں یا زاویوں کو لازم سمجھتے ہیں؟

ظاہر ہے تحقیق کی جان ہی اصولوں میں ہوتی ہے۔ تو تحقیق کے جو اصول و ضوابط اہل فن نے مقرر کیے ہیں وہ کسی بھی موضوع پر تحقیق کے لیے لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے صرفِ نظر کر کے حق تحقیق کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ وہی تحقیقات آگے چل کر ماخذ کا درجہ پاتی ہیں جن میں ان تحقیقی اصولوں کو برتا جاتا ہے۔ اس لیے میرے اصول بھی وہی ہیں اور ہر محقق کو انھیں اصولوں اور زاویوں کو مد نظر رکھ کر اپنا تحقیقی سفر جاری رکھنا چاہیے۔ تحقیق کے اصول تفصیل سے کتابوں میں مندرج ہیں وہاں دیکھ لینا چاہیے، یہاں ان کی تفصیل باعثِ تطویل ہوگی۔ تاہم کسی موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے مقدمات کی تنقیح، اصل ماخذ کی طرف رجوع، مختلف آرا کا مطالعہ، عصری تناظر، تنقیدی نظر اور تحریری دیانت داری وغیرہ بطورِ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

دین، زمانہ اور عقلی مکالمہ

9. آج کے زمانے میں دینی فکر اور عقلی مکالمہ (intellectual discourse) کے درمیان پل بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

اسلام دین فطرت ہے اور اس کے اوامر و احکامات عقل انسانی کے قطعاً منافی نہیں۔ اس لیے ہر دور میں دین کی تبلیغ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر کی گئی ہے اور اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ کیوں کہ قرآنی تعلیمات سے یہ بات مترشح ہے کہ دین کی دعوت میں جب حکیمانہ پہلوؤں کو مد نظر رکھا جائے گا اور ناصحانہ اسلوب کو

بروے کار لایا جائے گا تو وہ تبلیغ موثر بھی ہوگی اور عقل انسانی کو بھی اپیل کرے گی۔ اور پھر قرآن نے بار بار عالم انسانیت کو تعقل، تدبر، تفکر، اور فہم کی دعوت دی ہے۔ گویا دینی روح میں خود عقل کا استعمال بنیادی چیز ہے۔ اگر دینی فکر محض تقلیدی انداز میں پیش کی جائے اور عقل کی زبان میں گفتگو نہ کی جائے، تو وہ اپنے آپ کو وقت کے بدلتے چیلنجز کے مقابلے میں کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عقل کے ساتھ رشتہ قائم رکھ کر دین کی اَبدیت اور آفاقیت کو زیادہ مؤثر انداز میں ظاہر کیا جا سکتا ہے!۔ حقائق بتاتے ہیں کہ آج کا نوجوان سادہ روایتی بیانات سے مطمئن نہیں ہو پاتا، وہ کسی بھی موضوع پر دلیل، سوال، منطق اور تحقیق چاہتا ہے۔ یوں دینی فکر کو عقل کے ساتھ جوڑ کر ہی نئی نسل کے دلوں میں دین کی محبت اور فکری عظمت پیدا کی جا سکتی ہے۔

دنیا بھر میں علمی و فکری مکالمے کا معیار بہت بلند ہو چکا ہے۔ اگر محققین اسلام اور علماے ربانیین دینی موضوعات کو معاصر فکری زبان میں بیان نہ کریں، تو وہ عالمی سطح پر علم کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس لیے پچھلے ادوار کے مقابلے میں عصر حاضر میں عقلی مکالمے کی اہمیت مزید دوآتشہ ہو جاتی ہے، اور مبلغین و دعاۃ کے کاندھے پر بڑی ذمہ داری کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے؛ کیوں کہ اِس زمانے میں دینی تعلیم سے برگشتہ اور انوارِ علم سے محروم لوگ محض عقلی طور پر اسلام کو سمجھنے کی کوشش میں ٹھوکر پر ٹھوکر کھائے جا رہے ہیں اور پھر اسی کو دین سمجھ کر دوسروں پر تھوپنے کی کوشش میں غلطاں و پیچاں ہیں، جس کے نتیجے میں جہالت و گمراہی پروان چڑھ رہی ہے، دین بیزاری عام ہو رہی ہے، علم دین کا کھلے بندوں مذاق بن رہا ہے اور اصل تعلیم اسلام پس پردہ چلی جا رہی ہے۔

الغرض! آج کے زمانے میں دین کو دلیل، حکمت، اور بڑی محبت کے ساتھ پیش کرنا ہوگا، تب ہی ہم دینی فکر کو زندہ، عقل سے جڑا ہوا اور آنے والی نسلوں کے لیے متاثر کن بنا سکیں گے۔ اس لیے مفکرین اسلام اور داعیانِ دین کو چاہیے کہ وہ جدید ذہنوں کو حکمت عملی کے ساتھ دین کے قریب کرنے کی مومنانہ مساعی فرمائیں، شرعِ مطہر کی معقول توجیہات پیش کریں اور ہر قسم کے شکوک و شبہات کو رفع کر کے دین کا صحیح چہرہ دنیا کے سامنے لائیں اور یہی اس دور کی حقیقی تبلیغ ہوگی۔

10. کیا مدارس میں عقلی و فلسفیانہ مباحث کو شامل کیا جانا چاہیے یا یہ روایتی دینی سانچوں سے متصادم ہیں؟

جی بالکل! عقلی و فلسفیانہ مباحث کی مدارس میں شمولیت ضروری ہے بلکہ وہ شاملِ نصاب بھی ہیں، اور روایتی دینی سانچے سے ان کا کوئی تصادم بھی نہیں، یعنی عقلی و فلسفیانہ مباحث کبھی روایتی دینی ڈھانچوں سے متصادم نہیں رہے بلکہ اگر یہ کام سمجھ داری، معقولیت اور حکمت وبصیرت سے کیا جائے تو یہ خود دینی روایت کو زیادہ گہرا، زیادہ مستحکم اور زیادہ بامعنی بنا سکتا ہے؛ کیوں کہ فلسفیانہ مباحث دینی فکر کو گہرائی و گیرائی عطا کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ماضی میں یہ چیزیں ہمیں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دے رہی ہیں، اور ہماری قدیم اسلامی درس گاہیں فلسفہ، منطق، علم الکلام، فلکیات، طبیعیات اور ہیئت و مرایا حتیٰ کہ ریاضی تک کے فنون پڑھاتی رہی ہیں۔ اور ہمارے اکابر و مشاہیر جہاں حاویِ فروع واصول رہے وہیں ماہر معقول و منقول بھی رہے؛ اسی لیے کہا گیا ہے کہ منطقی و فلسفی مباحث سے ذہن و فکر کو قوتِ پرواز ملتی ہے اور استدلال کا ملکہ انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ دین کے تئیں اخلاص اور علم کے تئیں للّٰہیت کے اُس

جذبۂ دوشیں کے فقدان اور دونوں کے درمیان توازن قائم رکھ پانے کی عدم قابلیت نے ہمیں آج وہ دن دکھایا ہے کہ ہمیں عقلی وفلسفیانہ مباحث روایتی دینی سانچوں سے متصادم نظر آنے لگے ہیں، جس کے لیے ہمیں آج قدیم صالح اور جدید نافع کی اصطلاح وضع کرنی پڑی۔ لیکن اب چوں کہ طلبہ کے طبائع میں پہلوں کی سی جولانیت، خدمت دین کا اکابرانہ جذبہ اور دعوت وتبلیغ کی مومنانہ عزیمت مدھم سی پڑ گئی ہے؛ اس لیے ان مباحث کی شمولیت عصر حاصر میں بہرحال ایک سوالیہ نشان اور بڑا ہی نازک مرحلہ ہے، جس پر ارباب حل وعقد کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ غرضیکہ فلسفہ اور عقلی مباحث کسی بھی طرح دین کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت دین کے قلعے کو مزید مضبوط کرنے والے برج ہیں، بشرطیکہ انہیں حکمت، توازن، اور دینی مرکزیت کے ساتھ اپنایا جائے۔

11. کیا آپ کے خیال میں دینی حلقے جدید فلسفے، سوشل سائنسز اور عالمی سیاسی افکار سے متعلق کوئی مؤثر بیانیہ تشکیل دے رہے ہیں؟

بظاہر تو ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے کہ مجموعی طور پر دینی حلقے ابھی تک جدید فلسفے، سوشل سائنسز اور عالمی سیاسی افکار کے مقابلے میں کوئی مربوط اور مؤثر بیانیہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو سکے ہوں، یا ممکن ہے ایسا کچھ ہو رہا ہو لیکن مجھے نظر نہ آرہا ہو، اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تاہم یہ چیزیں ملت کی بقاو کمال اور اُمت کے عروج واقبال کے لیے ناگزیر ہیں۔ آج اُمت مسلمہ جس زبوں حالی کے دور سے گزر رہی ہے، قومی وبین الاقوامی سطح پر اہل اسلام کو جن مسائل گوناگوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور دین مصطفوی پر جس طرح سے یلغاریں ہو رہی ہیں ان سارے چیلنجیز سے نمٹنے کے لیے دینی حلقوں کا جدید فلسفے، سوشل سائنسز اور عالمی سیاسی افکار سے متعلق کوئی موثر بیانیہ تشکیل دینا وقت کا اولین فریضہ ہے۔ اور بدقسمتی سے جو لوگ خود کو جدید فلسفے کا علم بردار سمجھے بیٹھے ہیں، یا سوشل میڈیا پر اپنا ایک حلقۂ اثر قائم کیے ہوئے ہیں اور خود کو عالمی اسلامی مفکرین کے طور پر متعارف کروا رہے ہیں وہ وہی ہیں جو امت مسلمہ کو مسائلِ گوناگوں سے نجات تو نہ دلا سکے، ہاں داخلی وخارجی بہت سے مسائل سے اُمت کو دوچار ضرور کر دیا ہے، یا بلفظ دیگر انھوں نے اسلام کو فکروں سے آزاد کم کیا ہے اور فکر مند زیادہ بنا دیا ہے، یہ اس قسم کے مفکرین ہیں!۔ بہرحال! دینی حلقے کا اسلام مخالف تحریکوں کے خلاف ہمہ جہتی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے حرکت میں آنا نہایت ضروری ہے۔

شخصیت، طرزِ مطالعہ اور فکر کا دائرہ

12. آپ کا مطالعے کا معمول کیسا ہے؟ کس طرح آپ وقت کو تقسیم کرتے ہیں؟

عہد طالب علمی میں اور پھر چند سال قبل تک فقیر قادری کے مطالعے کا معمول بڑا منظم ومستحکم تھا، وقت کی تنظیم وتقسیم بھی خوب تھی، جس کی برکت سے بہت سے علمی وفکری کام آگے بڑھے اور تصنیفات کا سلسلہ قائم رہا؛ لیکن ادھر چند سالوں سے قومی وبین الاقوامی اسفار کا سلسلہ شروع ہوا اور زمینی طور پر کچھ مدارس وعلمی مراکز کے قیام وغیرہ میں مشغولیت بڑھی تو پھر طومارِ کار اور کثرتِ افکار کے باعث مطالعے کا معمول بھی متاثر ہوا ہے، تصنیف وتالیف کا کام بھی کچھ سرد سا پڑ گیا ہے اور وقت کی تقسیم بھی بکھر کر رہ گئی ہے۔ تاہم یہاں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ طلبہ واساتذہ کے لیے وقت کی تقسیم اور نظام الاوقات کی بڑی ہی اہمیت ہے اور یہ بہت ہی

بابرکت عمل ہے، جو لوگ اس راز سے آشنا ہو گئے وہ انفس وآفاق کی تسخیر میں لگے ہوئے ہیں اور جن پر یہ بھید مخفی رہا ہے وہ آج بھی برگِ آوارہ کی مانند زندگی کی کربناکیوں سے دوچار ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ شمال وجنوبِ ہند کی شرحِ خواندگی میں قریباً نصف فیصدی فرق ہے، یعنی جنوب ہند کے لوگ صد فیصد تعلیم یافتہ ہیں اور شمالی ہند کا معاملہ نصف فیصد سے کچھ زائد ہے۔ اس کے دیگر عوامل میں سے ایک اہم فیکٹر یہ بھی ہے کہ جنوبی ہند کے ارباب علم ودانش نے اپنے وقت کو منظم کر رکھا ہے، مطالعے کو زندگی کی خوراک بنالیا ہے اور یوں ہی ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کا ایک کام متعین کر کے انھوں نے ڈائری میں نوٹ کر لیا ہے جس سے ہر کام حسب معمول بخیر وخوبی انجام پذیر ہوتا رہتا ہے اور زندگی بڑی خوش اسلوبی سے رواں دواں رہتی ہے، جب کہ شمالی ہند کے احباب میں وقت کی تنظیم بالکل ناپید ہے، مطالعے کا معمول بھی قابل رحم ہے اور انھوں نے نظام الاوقات کی پابندی سے خود کو پورے طور پر آزاد کر لیا ہے، جس کی نحوست یہ ہے کہ کوئی کام سلیقے سے نہیں ہو پاتا اور وقت کا پہیا بے مقصد تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا رہا ہے!۔

13. کیا آپ کلاسیکی کتابیں زیادہ پڑھتے ہیں یا جدید تحقیقات پر بھی نگاہ رکھتے ہیں؟

کلاسیکی کتابیں ہوں یا جدید تحقیقات پر مشتمل فن پارے، ان میں جو میرے موضوع سے متعلق ہوتی ہیں خواہ وہ عربی وفارسی میں ہوں یا اردو وانگریزی میں، ان کا بھرپور مطالعہ کرتا ہوں، اور سفر وحضر میں انھیں ساتھ رکھتا ہوں۔ کلاسیکی کتابیں دراصل وہ بنیادیں ہیں جن پر ہماری فکری عمارت کھڑی ہے اور جن کے مطالعے سے ہماری فکر ونظریہ کو گہرائی، وسعت اور ایک خاص روحانی چمک عطا ہوتی ہے۔

ان کے ساتھ جدید تحقیقات بھی انتہائی اہم ہیں؛ کیوں کہ دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے، نئے سوالات جنم لے رہے ہیں، جدید علمی مناہج سامنے آرہے ہیں، اور نت نئی سائنسی اختراعات وسماجی تبدیلیاں انسانی سوچ کو متاثر کرتی جا رہی ہیں؛ لہٰذا ان تبدیلیوں کو سمجھنے کے ساتھ جدید فلسفہ، سوشیالوجی، پولیٹیکل سائنس، اور سائنسی رویوں پر نگاہ رکھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے؛ تاکہ ہم اپنے دینی ورثے کو عصر جدید کی روشنی میں مؤثر انداز میں پیش کر سکیں۔ ان کے علاوہ دیگر فنون کی کتب سے بھی دلچسپی قائم ہے؛ کیوں کہ کتابیں ہماری بے ضرر ساتھی ہیں اور یہ تنہائی کی بہترین مونس وغمخوار ہیں۔ لیکن ادھر یہ سلسلہ بھی کچھ متاثر ہوا ہے، جس کے پیچھے کچھ خانگی مسائل، والدہ کی مستقل تیمار داری اور جلسہ وکانفرنس کی وقت وبے وقت شرکتیں ہیں۔

14. فکر کی تشکیل میں مطالعے، مشاہدے اور تجربے—تینوں میں سے آپ کس کو سب سے مؤثر مانتے ہیں؟

فکر کی تشکیل میں مطالعے، مشاہدے اور تجربے تینوں کے اپنے اپنے حصے ہیں، اور تینوں میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک انسان کے فکر ومزاج پر اپنا رنگ چڑھاتے ہیں؛ تاہم ان میں تاثیریت کے لحاظ سے سب سے زیادہ تجربہ کو موثر مانا گیا ہے؛ کیوں کہ تجربہ انسان کو اپنی حدود، محاسن ومعائب، اور صلاحیتوں سے آگاہ کرتا ہے اور زندگی کا ایسا حقیقی فہم عطا کرتا ہے جو محض کتابوں یا مطالعہ ومشاہدہ سے حاصل نہیں ہوسکتا، ہاں! مطالعہ اور مشاہدہ تجربے میں معاون ہوتے ضرور ہوتے ہیں اور ہمیں فکر کی گہرائی تک پہنچنے کا موقع فراہم

کرتے ہیں۔

پھر یہ کہ لوگوں کی نفسیات وطبائع بھی کچھ الگ الگ ہیں، کوئی مطالعے سے متاثر ہوجاتاہے، کسی کو مشاہدے متاثر کر دیتے ہیں اور کوئی تجربات سے اَثر پذیر ہوتاہے۔ پھر اس میں عمر کا بھی فیکٹر ہوتاہے بچوں کے لیے مشاہدہ زیادہ موثر ہوتاہے، جوانوں کے لیے مطالعہ کی تاثیر ہے اور ادھیڑ عمروں کے لیے تجربات قابل تاثیر وتاثر ہیں۔ اس لیے تینوں کی اپنی اپنی قدریں ہیں اوران کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔

15. آپ کی شخصیت میں جو وقار اور گہرائی ہے، کیا یہ فطری ہے یا مطالعے اور خاموشی کا ثمر؟

شخصیت بھاری بھر کم لفظ ہے جو بڑوں کے لیے بولا جاتاہے، ہم تو ابھی ٹھیک سے ’شخص‘ بھی نہ بن پائے ہیں۔ یوں ہی وقار اور گہرائی بھی اکابر کے لیے زیبا ہے۔ تاہم لوگ اگر ہمیں کچھ سمجھتے ہیں تو یہ محض فضل مولیٰ ہے جس نے احباب کے دلوں میں فیض عقیدت انڈیل دیاہے۔ ہر انسان کی شخصیت میں کچھ فطری عناصر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ فطرتاًبڑے سنجیدہ اور متین واقع ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت میں گہرائی ہوتی ہے، اور کچھ لوگوں کے اندر فطری خاموشی پائی جاتی ہے، میری طبیعت پر بھی بچپن ہی سے خاموشی کا غلبہ رہا۔ کہاجاتاہے کہ خاموشی انسان کو خود کی پہچان دیتی ہے اور اسے اپنے اندر کی آواز سننے کا موقع فراہم کرتی ہے، جو اس کی شخصیت میں وقار اور پختگی پیدا کرنے کا ذریعہ ووسیلہ بنتاہے۔

لیکن خاموش طبعی کے ساتھ میرا جذبہ وحوصلہ اخاذیت سے بھرپور رہا، اور کچھ نیا کرنے کی لگن نے ہر دم مجھے محوپرواز رکھا؛ یہ اور بات کہ ابھی کچھ کر نہیں سکا۔ خدائے جلیل وقدیر توفیق خیر سے نواز دے تو بات ہے، ورنہ تجربات، مشاہدات اور مطالعات سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ہاں! یہ بات درست ہے کہ مطالعہ کتب اور مشاہدۂ فطرت کے باعث زندگی میں بہت سی مثبت تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں، اور یہ عمل زندگی کے ساتھ جاری وساری ہے۔

تصنیف کی نفسیات اور قلم کی طاقت

16. تحریر کرتے وقت آپ کی توجہ "اسلوب" پر زیادہ ہوتی ہے یا "مفہوم" پر؟

ہر چند کہ مفہوم اوراسلوب دونوں ہی تحریر کے اہم اجزا ہیں؛ لیکن مفہوم کو اسلوب پر بایں معنی تفوق حاصل ہے کہ تحریر کا اولین مقصد ہی قاری تک ایک واضح وموثر پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر کسی کی تحریر کا مفہوم دوٹوک اور معقول نہ ہو تو اس کا قاری کے اوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، خواہ اس کا اسلوب کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ مفہوم ہی دراصل تحریر کی روح ہوتاہے اور یہ عنصر تحریر میں جتنا زیادہ موجود ہوتاہے قاری کے ذہن میں اتنا ہی اثر ڈالتاہے اور اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتاہے۔

اس لیے میرا ذاتی معاملہ یہ رہا کہ تصنیف وتالیف کے ابتدائی ایام میں زیادہ تر توجہ اسلوبِ نگارش پہ رہا کرتی تھی؛ لیکن جیسے جیسے پختگی آتی گئی، اور قلم پر گرفت مضبوط ہوتی گئی، پھر مفہوم ومقصد ہی پیش نظر رہنے لگا، اوراُسلوب کی حیثیت ثانوی ہوکر تحریر کے تابع ہوگئی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ڈرائیونگ کے ابتدائی ایام میں زیادہ تر توجہ گیر پر مرکوز ہوتی ہے، لیکن جب کمال پیدا ہوجاتاہے تو پھر لاشعوری طور پر ازخود حسب رفتار گیر لگتے چلے جاتے ہیں اور انسان حسن فطرت اور مناظر قدرت

سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ الغرض! جب تحریر کو زیادہ مؤثر بنانا ہو تو مفہوم اور اسلوب دونوں میں توازن قائم رکھنا ایک قلم کار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ دونوں کے توازن و توافق سے بہترین تخلیق ابھر کر سامنے آتی ہے۔

17. کیا آپ کے خیال میں ہر مصنف کو زبان پر مکمل گرفت ہونی چاہیے یا خیالات کی صحت کافی ہے؟

زبان پر گرفت اور خیالات کی صحت دونوں ہی ایک قلم کار کی نگارشات کی طاقت و ربنیادیں ہیں؛ لیکن ہر ایک کا کردار مختلف ہے، تاہم یہاں بھی توازن قائم رکھنے کی صورت میں انتاجات نہایت موثر کن ہوں گے۔ تاہم ایک جہت سے دیکھا جائے تو خیالات کی صحت زیادہ اہمیت کی حامل ہے؛ کیوں کہ یہ تحریر کی حقیقت اور مقصدیت ہے؛ مگر ساتھ ہی زبان پر گرفت بھی ضروری ہے؛ تاکہ خیالات کو موثر طریقے سے پہنچایا جا سکے۔ ایک مصنف کو دونوں پہلوؤں پر محنت کرنی چاہیے؛ تاکہ وہ اپنی تحریر کو مکمل اور مؤثر بنا سکے۔

اس کے ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی یہاں ضروری ہے کہ خیالات کی صحت اپنی جگہ لیکن ترسیل کے لیے زبان پر مکمل گرفت بھی ایک مصنف کے لیے ناگزیر ہے۔ خیالات درست ہیں لیکن زبان پر اگر قدرت نہیں تو حقِ ابلاغ ادا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایک مصنف کے لیے زبان پر مکمل گرفت اور اس کے مالہ وماعلیہ سے بتمام وکمال واقفیت ضروری ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ زبان وبیان پر اپنی گرفت مضبوط کر کے آج اپنے باطل خیالات ونظریات کو وہ حق کا لبادہ اڑھا کر ببانگ دہل پیش کر رہے ہیں اور سادہ لوح بلکہ نیم خواندہ لوگ بھی اس کی قدرتِ بیان پر سر دھن رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے خیالات کی صحت کے ساتھ زبان پر قدرت وکمال بھی از حد ضروری ہے۔

18. کیا کبھی ایسا ہوا کہ ایک تحریر کو مکمل کرنے میں کئی مہینے لگے ہوں، محض اس لیے کہ دل مطمئن نہ ہو؟

کچھ بھی لکھنے میں وقت تو درکار ہوتا ہی ہے، میری بیشتر کتابیں کئی ماہ میں مکمل ہوئیں، بلکہ قاموس الخواتین کی تین جلدیں تو لاک ڈاون کے تین سالوں میں تکمیل پذیر ہوئیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کئی ماہ کسی ایک موضوع پر خامہ فرسائی کی ہو اور پھر اس پر اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوا ہو تو دوبارہ اس پر محنت کرنی پڑی ہو۔ میری تحریروں کے ساتھ فضل الٰہی اور عنایت رسالت پناہی کا معاملہ زیادہ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو میں حیران ہو جاتا تھا کہ میرا موضوعِ نگارش کچھ ہوتا تھا اور کتاب کسی دوسرے موضوع کی پڑھ رہا ہوتا تھا مگر اس میں بھی میرے موضوعِ زیر تحریر سے متعلق مواد میسر آجاتا تھا، اسے میں اپنے رب کریم کا فضل اور اپنے آقا کی عنایت نہ کہوں تو کیا کہوں!۔

19. قلم کے ذریعے آپ معاشرے میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟

ہر مصنف کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی نگارشات قوم کی تقدیر بدل ڈالے، ملت کے مسائل کی تحلیل کی راہ ڈھونڈ نکالے، اور اُمت کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کی کوئی ترکیب کر ڈالے؛ کیوں کہ قلم وہ طاقتور ہتھیار ہے جو ایک انسان کی زندگی میں سماجی، ثقافتی اور فکری انقلاب بپا کر سکتا ہے۔ قلم کا اصل مقصد صرف لفظوں کی ساحری نہیں بلکہ رازِ حیات آشکار کرنے کا یہ ایک بہترین وسیلہ اور زندگی کو بہتر بنانے کا ایک حوصلہ بخش قرینہ ہے۔ بلاشبہہ اگر نیت مبنی بر اخلاص ہو اور سوچ کا قبلہ درست ہو تو قلم حال کی تابناکی، مستقبل کی رہنمائی اور دور جدید کی اصلاح میں اہم

کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہمارے عزائمِ نگارش بھی کچھ یہی تھے؛ لیکن ان کے ساتھ میں نے اپنی تحریروں کا رخ زیادہ تر نوجوانوں کی فکری تعمیر کی طرف رکھا، گوشۂ اطفال پر خصوصی توجہ مرکوز کی اور بزمِ خواتین کی اصلاح پذیری پر زیادہ زور دیا اور بحمد اللہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیابی بھی ملی۔ میں نے ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو اچھوتا اور دل چھوتا ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ اچھوتے موضوعات پر قارئین کو جب کوئی کتاب میسر آتی ہے تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور جی جان سے اس کے مطالعے میں لگ جاتے ہیں۔

نوجوان اہلِ علم کے لیے رہنمائی

20. نوجوانوں کو علم و تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لیے کیا طریقہ کار مؤثر ہو سکتا ہے؟

یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آج کے نوجوانوں کو علم و تحقیق کی طرف مائل نہ کیا گیا، تو کل کا ہمارا مسلم معاشرہ فکری و تخلیقی طور پر بانجھ ہو سکتا ہے۔ نوجوانوں کو تحقیق کی طرف لانے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق کو زندہ، بامعنی، دلچسپ، اور عزت دارانہ عمل بنایا جائے۔ انہیں بلا تکلف سوال کرنے، تلاش و تحقیق کرنے، اور تجربہ ومشاہدہ کرنے کی آزادی دی جائے۔ اور سب سے بڑھ کر انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا علم دنیا میں ایک فرق ڈال سکتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی چیز کی طرف از خود مائل نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ اسباب وعوامل ہوتے ہیں۔ پچھلے اَدوار میں تصنیف و تالیف کے لیے سنہرا ماحول تھا، مصنف کی قدر و تحسین تھی، کتابوں کی خواندگی کا عام چلن تھا اور لوگ اپنے بڑوں کی قلمی مصروفیت و علمی مشغولیت دیکھ کر خود کو اسی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آج کا ماحول یکسر مختلف ہے، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں، نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں۔

تاہم نوجوانوں کے سامنے اسلاف کے قیمتی کارنامے رکھے جائیں، قلم کی شاہ جہانی بتائی جائے، تحریر کی افادیت کے مختلف پہلوؤں کو ان کے سامنے آشکار کیا جائے، ان کی علمی سطح کو دیکھتے ہوئے مباحثہ ومکالمہ کی محفلیں سجائی جائیں، تحقیقی منصوبے پیش کیے جائیں، ڈیجٹل دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ سوال وجواب کی نشستیں رکھی جائیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تحسین وحوصلہ افزائی کی جائے تو اُمید ہے کہ خاکستر میں دبی کوئی چنگاری باہر نکل آئے۔ ویسے اس سلسلے میں مخیر حضرات اور اہل مکتبہ نو آموز قلم کاروں کی مالی معاونت ، معاشی مسائل سے آزادی دلا کر نیز ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کر کے اس سلسلے میں بڑا رول ادا کر سکتے ہیں۔

21. کیا آج کے طالبعلم میں وہ تڑپ اور پیاس موجود ہے جو تحقیق کے لیے ضروری ہے؟

کسی چیز کی تڑپ، للک اور لگن از خود پیدا نہیں ہوتی بلکہ پیدا کی کرائی جاتی ہے اور اس کے لیے ماحول ساز گار کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ فطری خو بولے کر آتے ہیں وہ مستثنیات میں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں آج بھی کچھ سیکھنے، کچھ بڑا کرنے، دنیا کو سمجھنے اور تحقیق میں کچھ نیا تلاش کرنے کی آرزو پائی جاتی ہے؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بروقت انہیں ایسی راہنمائی، مشاورت، ماحول، اور تحریک نہیں ملتی جو ان کی اس آرزو کو شعلہ بنا دے۔ بلکہ میرا تو وجدان کہتا ہے کہ اگر آج کے نوجوان کو سچے جذبے سے سکھایا اور ابھارا جائے تو وہ ماضی

کے کسی بھی بڑے محقق سے کم نہیں ہو سکتا بلکہ شاید وہ ان نئے امکانات کی راہیں بھی کھول دے جو پہلوں پر بند تھیں!۔

لیکن بس کیا کہیے، آج ہمارے مدرسوں میں تعلیم کا افلاس، روحِ تربیت کا فقدان اور طلبہ کی حال و مستقبل سے بے خبری انھیں ایک باخبر عالم تو بنا ہی نہیں پاتی، پھر ان میں کبریتِ تحقیق ڈھونڈنا کسی بانجھ سے اولاد کی توقع رکھنے کے مترادف ہے۔ تاہم اگر طلبہ مدارس پر واقعی محنت کی جائے، خوشگوار ماحول بنایا جائے اور ان کے حال احوال سنوارے جائیں تو کوئی بعید نہیں پھر انھیں میں سے کوئی سینا و فارابی، رومی و رازی اور غزالی و سیوطی بن کر نکلے۔ لیکن یہ بڑا زہرہ گداز اور پتاماری والا کام ہے اور وہی مردِ غازی کر سکتا ہے جس کے اندر سپیدۂ سحر دیکھنے کے لیے خونِ صد ہزار انجم کر دینے والی جگر تابی موجود ہو۔

22. آپ کی نظر میں ایک سچے محقق کے اندر کن اخلاقی صفات کا ہونا لازمی ہے؟

ایک سچے محقق کے لیے اخلاقی صفات ومثالی اوصاف سے متصف ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ تحقیق کا مقصد صرف معلومات کی ذخیرہ اندوزی ہی نہیں ہوتی بلکہ سچائی کی تلاش، علم کی خدمت، اقدارِ دین کا فروغ اور قوم وملت کی صلاح وفلاح بھی اس کے عمومی مقاصد میں شامل ہوتی ہے؛ اس لیے ایک سچے محقق کے لیے یوں تو بہت سے اَوصاف درکار ہیں؛ تاہم کچھ مرکزی صفات یہ ہونی چاہئیں: حزم واحتیاط، صبر و تحمل، اخلاص وللّٰہیت، دردِ اُمت، ادبِ اختلاف، علمی دیانت و امانت داری، انصاف پسندی، تواضع و انکساری، اوراحساسِ ذمہ داری وغیرہ۔

اختتامیہ: بصیرت افروز پیغام

24. آخر میں "رازِ حیات" کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی خاص پیغام — جو فکر کو بیدار کرے، قلم کو جھنجھوڑ دے، اور دل کو گرما دے؟

پہلے تو ''رازِ حیات'' کے اجرا پر صمیمِ قلب سے ڈھیروں مبارکباد۔ پھر اس اولین شمارے کے ''فہم دانش'' کالم کے لیے مجھ ہیچ مداں کے انتخاب کے لیے ہدیۂ تشکر وامتنان۔ یقینا میں کسی اعتبار سے اس قابل نہیں تھا؛ لیکن آپ کی مجلس ادارت ومشاورت نے نہ معلوم کیا سوچ کر انٹرویو کے لیے مجھے منتخب کیا، بہر حال! اللہ بس پردہ رکھے اور احباب کے حسنِ ظن کے مطابق مجھے فرمادے؛ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

''**رازِ حیات**'' کے قارئین کے لیے پیغام یہی ہے کہ وہ رازِ حیات کو جاننے اور سراغِ زندگی کو پانے کی مومنانہ کوشش اور آبرومندانہ جتن کریں؛ کیوں کہ جسے اپنی ذات وحیات کا عرفان ہو جاتا ہے، پھر اسے خالقِ کائنات کی معرفت بھی نصیب ہو جاتی ہے، اور خود شناسی سے خداشناسی کی منزل بالکل لگی ہوئی ہے۔ معروف عربی مقولہ ہے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یاد رکھیں کہ علم کی راہیں آسان نہیں ہوتیں؛ لیکن انھی راہوں پر ایسی کرنیں بکھرتی ہیں جو صدیوں کو زندہ کر دیتی ہیں، قوموں کے بختِ خفتہ کو جگا دیتی ہیں، اور قلب و روح کو منبعِ انوار بناڈالتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ مخلص ہو کر تحصیل علم میں جٹ جائیں۔ اور جب راہِ علم کے مسافر بن جائیں تو منزل کی تمنا نہ کریں، بس راستے سے محبت کریں، ایک دن راستہ ہی منزل بن جائے گا۔ یا یوں سمجھیں کہ علم کا سفر منزل تک نہیں رکتا بلکہ علم کا سفر انسان کو خود منزل بنا دیتا ہے۔

نیز دین کو محض اللہ و رسول کی رضا کے لیے

سیکھیں۔ تقویٰ خداوندی سے دل و دماغ کو معطر رکھیں، اس کی برکت سے ایک وقت آئے گا کہ علم لدنی کے در آپ پر واہوں گے اور ربانی سرچشموں سے آپ کو جرعۂ علم و کمال عطا کیا جائے گا۔ اور پھر اپنے علم کو رنگِ عمل دینے کی کوشش کریں کہ یہی مقصد علم اور مقصودِ شرع ہے۔ اصل علم وہی ہے جس کو لبادۂ عمل پہنا دیا گیا؛ ورنہ ناآشنائے عمل علم بس ایک اضافی بوجھ ہے جسے انسان زندگی بھر اپنے کاندھے پر ڈھوتا پھرتا ہے۔ علم پر عمل کی برکت یہ ہوگی کہ اللہ آپ کو نامعلوم علوم کا وارث و امین بنا دے گا۔

تیسرے یہ کہ لوح و قلم سے اپنا مخلصانہ تعلق اُستوار رکھیں۔ دنیا چاہے جتنی ترقی کر جائے، اور سائنس و ٹکنالوجی چاہے معراجِ کمال تک پہنچ جائیں؛ لیکن کتاب و قلم کی اہمیت وافادیت مسلم رہے گی۔ لوگ کہتے ہیں "یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق ہے"، لیکن یہ بالکل فضول بات ہے، ہر دور کتاب کا دور رہے گا، نون والقلم کی فتوحات اور الکتاب کی تابانیاں ہر عہد کی پیشانی کو جگمگاتی رہیں گی۔

وقتی طور پر کوئی انقلاب آجائے تو اس سے حقیقت بدل نہیں جایا کرتی، حقیقت حقیقت ہی رہتی ہے اور کتاب و قلم یہ وہ زندہ حقیقتیں ہیں جن کی تابانیوں کو زمانے کے ہزاروں انقلابات بھی مل کر مدھم نہیں کر سکتے۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کل جن چیزوں کو ہم نے ناکارہ اور آؤٹ ڈیٹیڈ سمجھ کر کتابِ زندگی سے باہر کر دیا تھا آج خواہی نخواہی ہم انھیں لازمۂ حیات بنانے پر مجبور ہیں۔ روزمرہ کی زندگی سے اس کی درجنوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

یوں ہی چیٹ جی ٹی پی، گروک، اے آئی اور چیٹ جیمینائی وغیرہ کی ایجاد واختراع سے کوئی یہ سمجھ لیے کہ کتاب کی افادیت یا قلم کی شہنشاہیت ختم ہو جانے والی ہے تو یہ اس کی خام خیالی اور نری مرعوبیت ہوگی۔ ہر دور کتاب و قلم کا مرہون منت رہے گا، بلکہ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ یہ سب کتاب و قلم کا اُترن ہی ہے جو آج ماڈرن سائنس و ٹکنالوجی کے ماتھے کا جھومر بنا ہوا ہے۔

"رازِ حیات" کے قارئین پر ایک بھید اور کھول دوں اور اپنا ایک ذاتی تجربہ شیئر کر دوں کہ تعلیم کے آخری اور تدریس کے ابتدائی ایام ہی میں جن علمی و فکری کام کا تانا بانا بن سکتے ہیں، بن لیں؛ کیوں کہ اس وقت آپ کے پاس ہر طرح کی توانائی و فارغ البالی ہوتی ہے، اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے طومار کار و کثرتِ افکار ایسے دامن گیر ہوتے ہیں کہ انسان کے لیے ان سے خلاصی جان امر دشوار بن جاتا ہے اور پھر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آج میں خود اس دور سے گزر رہا ہوں؛ اس لیے عزیز طلبہ کے لیے یہاں اسے شیئر کر دینا مناسب سمجھا۔

مذکورہ بالا بات کہنے کی ضرورت اِس لیے محسوس ہوئی کہ ہم میں بہت سوں کا معاملہ -اِلا ماشاء اللہ- یہ ہے کہ وہ پوری زندگی خود کو 'ناقص' ہی تصور فرماتے رہتے ہیں، اور نتیجے میں کچھ نہ کر کے بالآخر داغِ حسرت لیے آخرت کو سدھار جاتے ہیں؛ حالاں کہ اپنی بے پایاں لیاقتوں اور علم و تجربات کے سیل بے کراں سے ایک زمانے کو مستفیض کرنے کی اُن میں صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اِس طرح وہ آنے والی نسلوں کو اپنے عظیم سرمایۂ فضل و کمال سے محروم کر جاتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ساری زندگی خود کو اِحساسِ کمتری کے آہنی حصار سے باہر ہی نہیں نکال پاتے؛ بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ اگر کچھ دوسرے کمزور

عزم لوگ اُن کے ہتھّے چڑھ جائیں تو انھیں بھی اپنے حصار کے اندر کھینچنے میں پوری چابک دستی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔ اس طرح یہ بلائے بے درماں -جو دراصل منفی سوچ کا شاخسانہ ہوتی ہے- بڑھاپے تک اُن کے تعاقب میں لگی رہتی ہے، اور ہر تعمیری و تخلیقی کاز کے بیچ حد فاصل بن جاتی ہے۔

کاش! انھیں کوئی بتا دیتا کہ 'کامل' تو بس ایک ہی ذات ہوئی ہے اور وہ ہے ذاتِ رسول مقبول ﷺ، باقی کسی کو درجۂ کمال کہاں نصیب!؛ لہٰذا اِعترافِ 'نقص' کے ساتھ ہی اِنسان جتنا کچھ کر سکتا ہے کرلے کہ شاید یہی اُس کے لیے توشۂ آخرت اور سرمایۂ بخشش بن جائے۔ بقولِ شاعر

لئن لم یعظ العاصین من ھو مذنب ... فمن یعظ العاصین بعد محمّد !

یعنی اگر ایک خطاکار کو یہ حق نہیں کہ وہ گنہ گار بندوں کو وعظ و نصیحت کرے تو پھر مجھے بتایا جائے کہ محمد عربی ﷺ کے بعد گنہ گاروں کو نصیحت کرنے کا جواز کس کے پاس ہے؟ (کیوں کہ آپ کے علاوہ نقص وخطا سے پاک ہونے کا دعویٰ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا!)۔

یاد رکھیں کہ مثبت افکار وخیالات ہی اِنسان کی کامیابی کا زینہ ہوتے ہیں؛ لہٰذا مشورہ یہی ہے کہ مثبت سوچ اپنائیں اور منفی سوچ سے چھٹکارا پائیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ مثبت سوچ نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔ دین، دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں مثبت سوچ ہی کی مرہونِ منت ہیں، اور تمام ناکامیوں کی تہہ میں کہیں نہ کہیں منفی سوچ ہی کی کارستانی دکھائی دیتی ہے۔ یاد رکھیے کہ اِنسان کے جملہ اَعمال و اَفعال میں سوچ کی حیثیت وہی ہے جو مکان کی تعمیر میں نقشہ کی ہوتی ہے۔ لہٰذا جیسا نقشہ ویسا مکان، اور جیسی سوچ ویسا اِنسان۔ اللہ بس ہمارے حال پر کرم فرمادے۔ آمین

اے صاحبانِ "**راز حیات**"! اٹھیں، سوچیں اور لکھیں کہ آپ کے قلم سے حیات کی نئی تعبیر پھوٹ سکتی ہے اور

آپ وہ انقلابی نسل ہیں جو پرانی دیواروں میں نئے دریچے کھولنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہیں۔ میری دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کی سوچوں کو حکمت عطا کرے، آپ کے قلم کو سچائی کی روشنائی دے، اور آپ کے سفر کو اپنے نور سے معمور فرمادے!۔

مسلم خواتین، مغربی تہذیب اور اصل جدیدیت

دیا عقیل۔ پاکستان

اے مسلمہ!

تو وہ گوہرِ نایاب ہے، جس کے وجود سے انبیاء و اولیاء کے سلسلے پروان چڑھے، جس کی عظمت کی گواہی خود نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دی۔ بیٹی کی صورت میں چادر بچھا دی، بیوی کی حیثیت سے مشورہ لیا، ماں کی صورت میں جنت کو قدموں تلے رکھا۔ تو وہی اساس ہے جس پر اسلامی معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ اسی لئے ازل سے دشمنانِ اسلام کی نظریں تجھ پر جمی ہوئی ہیں، کہ اگر کسی ایک در سے اسلامی قلعہ میں دراڑ ڈالی جا سکتی ہے تو وہ در، "خواتین" کا ہے۔

آج لمحۂ فکریہ ہے کہ جس کھوکھلی اور زہر آلود جدیدیت کو مغربی تہذیب کے نام پر مسلم خواتین کے سامنے "ترقی" کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے، وہ دراصل جاہلیتِ اولیٰ کا نیا روپ ہے۔ افسوس! ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں بلا تحقیق و فہم اس چمکدار مگر کھوکھلے خول کو قبول کر رہی ہیں۔

پردے کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ جان کر ترک کیا جا رہا ہے، عبائے کے اندر رہ کر بھی نگاہیں حیا کی حد پار کر رہی ہیں، اور خاندانی نظام کو بیروں کی زنجیر سمجھ کر کیریئر کو مقدم جانا جا رہا ہے۔

کیا یہی وہ "جدیدیت" ہے جس کے نام پر شرم و حیا، وقار و عفت اور ماں کے مقدس کردار کو مٹایا جا رہا ہے؟ کیا یہی وہ "آزادی" ہے جو عورت کو اس کے سب سے بڑے وقار، یعنی گھر کی ملکہ ہونے کے شرف سے محروم کر رہی ہے؟

یاد رکھو!

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے عورت کو صدیوں کی تاریکیوں سے نکال کر عزت، تحفظ اور حیاتِ طیبہ کی روشنی عطا کی۔ جب دنیا کی بڑی تہذیبیں عورت کو قابلِ ذکر نہ سمجھتی تھیں، اسلام نے اسے بیٹی، ماں، بہن، بیوی جیسے رشتوں کی تقدیس بخشی۔ اسے وراثت کا حق دیا، اس کی گواہی کو معتبر مانا، اور اسے تعلیم و تربیت کے نور سے منور کرنے کا حکم دیا۔

جب مغرب کی عورت صدیوں تک ظلم، حق تلفی اور بے توقیری کا شکار رہی، تب اسلام کی عورت علم، ادب، حیاء اور روحانی عظمت کی معراج پر تھی۔

انیسویں صدی کے بعد، جب مغربی عورت کو نیم حقوق ملے، وہ بھی اس لیے تاکہ صنعتی نظام میں اسے مشین کی طرح استعمال کیا جا سکے۔ نتیجتاً، وہ باہر کے کاموں کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمے داریاں بھی اٹھانے پر مجبور ہو گئی، اور اب، خود مغربی عورتیں اس جعلی مساوات سے عاجز آ کر گھر کی چار دیواری میں عزت و سکون ڈھونڈنے لگی ہیں، جبکہ ہماری مسلمان بہنیں اسی دلدل کو ترقی کا راستہ سمجھ رہی ہیں۔

اے بیٹی اسلام!

تو وہ ہستی ہے جس کی گود نسلوں کی تربیت گاہ ہے۔ جب تجھے اپنے ہی دین کی تعلیمات اور اپنے ہی نبی کی سیرت سے ناآشنائی ہو جائے، تو آنے والی نسل کہاں سے ہدایت پائے گی؟

تو وہی ہے جسے ازواجِ مطہرات اور صحابیات کی

وارث بننا تھا۔ ان کے نقش قدم پر چل کر دین کی خدمت اور نسلوں کی تربیت کرنی تھی۔ لیکن افسوس، آج وہی مسلم عورت مغرب کے پروپیگنڈا کا شکار ہو کر، اصل جدیدیت یعنی اسلام کو پیچھے چھوڑ کر پھر جاہلیت کی طرف بڑھ رہی ہے۔

یاد رکھو!

اسلام ہی اصل "ماڈرن ازم" ہے، جس نے عورت کو عزت کے تاج سے نوازا۔ وہ مغربی تہذیب جو پردے کو قید کہتی ہے، دراصل عورت کو بازار کی زینت بنا کر اس کی عظمت کو پامال کرتی ہے۔ جو حقوق کے نام پر عورت کو گھر سے نکالتی ہے، وہ دراصل اس کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔

اے مسلمہ! واپس پلٹ آو۔ اپنی اصل پہچان کو پہچانو، شرم و حیا کے جوہر کو دوبارہ سینے میں جگہ دو۔ سیرتِ صحابیات کو اپنی راہ بناو، قرآنی تعلیمات کو زادِ راہ بناؤ۔ یہ تمہارا دین ہی ہے جو تمہیں ماں بن کر جنت کا دروازہ بناتا ہے، بیٹی بن کر رحمت، بہن بن کر عزت اور بیوی بن کر محبت و تحفظ کا سایہ عطا کرتا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں فتنوں سے محفوظ رکھے، اور قرآن و سنت پر کامل عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین!

برگ تبسم

شاہد نعمانی مصباحی

یہ دنیا کب قہقہوں سے خالی ہوئی، شاید کسی نے نوٹس نہ لیا۔ نہ کوئی اخبار کی شہ سرخی بنی، نہ کوئی احتجاج ہوا، نہ کوئی قرارداد آئی۔ ہاں، دلوں کی گلیوں میں خاموشی ضرور چھاگئی۔ وہ مسکراہٹیں جو کبھی بے ساختہ ہوا کرتی تھیں، اب تربیت یافتہ بن گئی ہیں؛ جیسے کسی اسکول سے ہنسی کی ڈگری لے کر آئی ہوں۔

آج کا انسان مسکراہٹ کو فیس بک کے ری ایکشن میں تلاش کرتا ہے، اور قہقہہ، صرف وائرل ویڈیوز میں سنائی دیتا ہے۔

تبسم اب بھی موجود ہے، مگر جیسے کسی اداس سطر کے آخر میں لگایا گیا نیم جان سا قوسین — صرف آداب کی مجبوری میں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں، اگر مسکرانے پر ٹیکس لگتا تو دنیا میں کتنی کمزور حکومتیں مضبوط ہو جاتیں!

اور شاید ہم، جو دل سے مسکرانے کا ہنر بھول چکے ہیں، کبھی کسی تبسم پر بھی صدقہ دیتے۔

برگِ تبسم محض مزاح کا گوشہ نہیں، یہ زندگی کی اُس نازک طناب کا نام ہے، جو ہمیں تلخیوں کی اندھی کھائی سے کھینچ کر نکال لاتی ہے۔

یہ وہ لفظی چراغ ہے جو دل کے کونے میں رکھی گئی اداسی کی تاریکی پر روشنی کرتا ہے۔

کیونکہ کبھی کبھی، ایک خالص مسکراہٹ کسی پورے مقالے سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

ایک چٹکی بھر ہنسی، کسی غم کی چٹان کو توڑ دیتی ہے۔

ایک سادہ سا قہقہہ، اندر کے شور کو خاموش کر دیتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ برگِ تبسم فقط ایک صفحہ نہ ہو، بلکہ ایک پناہ ہو — ان سب کے لیے جن کے دل غم سے بوجھل ہیں، مگر چہرے پر مسکراہٹ رکھنا نہیں بھولے۔

تو اگر کبھی دل اداس ہو، تو اس صفحے کی طرف آیئے۔

یہاں کچھ مسکراہٹیں محفوظ رکھی ہیں،
محبت کی طرح، دعاؤں کی طرح، اور زندگی کی طرح نازک، مگر ہمیشہ کے لیے

حمد باری

محبوب گوہر اسلام پوری

پیامِ صبح و مسا لاالہ الا اللہ
شجر حجر نے کہا لا الہ الا اللہ

ملائکہ کی زبانوں پہ ہے یہی کلمہ
ہے ہر بشر کی صدا لا الہ الا اللہ

فضائیں پڑھتی ہیں خالق کے نام کی تسبیح
ہے گنگناتی ہَوا لا الہ الا اللہ

یہی ترانہ مکینانِ باغ و گُل کا ہے
ہے بلبلوں کی نَوا لا الہ الا اللہ

ستونِ دین ہے اسلام کی اساس ہے یہ
یقینِ صدق و صفا لا الہ الا اللہ

بغیر اس کے تصور نہیں عبادت کا
ہے رب کی حمدو ثنا لا الہ الا اللہ

نجات اُس کے لئے مغفرت ہے اُس کے لئے
ہے جس نے دل سے پڑھا لا الہ الا اللہ

جہاں کے سارے مسائل کا حل اسی میں ہے
ہے دردِ دل کی دوا لا الہ الا اللہ

دعا یہی ہے کہ وقتِ اجل بھی اے گوہر
رہے وظیفہ مرا لا الہ الا اللہ

سخن تلاشی

کلام مولانا محبوب گوہر اسلام پوری

بزم حسان کے شکریہ کے ساتھ

میں چاہتا ہوں نعت حبیب خدا لکھوں — پھر سوچتا ہوں کیسے لکھوں اور کیا لکھوں
فرمائے خدا میری مدد روح قدس سے — جب جب حضور آپ کی مدح و ثنا لکھوں
روشن چراغ علم جو ہے کائنات میں — کیوں کر اسے نہ جلوہ غار حرا لکھوں
ہیں دونوں لفظ حق و صداقت پہ مشتمل — خاک در نبی کو شفا یا دوا لکھوں
رکھتا ہے مفلسی میں پڑوسی کا جو خیال — تعلیم مصطفیٰ سے اسے آشنا لکھوں
مکہ کی اک ضعیفہ کا یاد آے گا سفر — کردار مصطفیٰ کا اگر تذکرہ لکھوں
گوہر نہیں ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ — گر اپنے فن کو صدقہ احمد رضا لکھوں

گورا رنگ، میانہ قد، مناسب ڈیل ڈول، خوش گفتار، خوش رفتار، نرم خو، سنجیدہ مزاج، مہذب و مودب، شائستہ و شگفتہ، چہرا مثل کتاب، آنکھوں پر حیا کا حجاب، چوڑی پیشانی اخوت کی نشانی، سر پر حنائی بال، ذہن محو خواب و خیال، خوش سیرت و خوش صورت، عجز و انکساری کی مورت، یہ ہیں سخن ور بے مثال، شاعر باکمال، صاحب ذوق نوری، محترم محبوب گوہر اسلام پوری۔

گوہر صاحب ریاست بہار کے مردم خیز ضلع سیتامڑھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتہائی خلیق، شگفتہ مزاج، ادب و آداب سے آشنا اور اصاغر نواز و اکابر پرور شخصیت کے حامل ہیں۔ بزرگوں کے محبوب نظر اور حلقہ عوام و خواص میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے جہد مسلسل، سعی پیہم، تگ و دو، محنت و لگن، کد و کاوش، جگر کاوی و جاں فشانی اور مطالعہ و ممارست سے جہان شعر و ادب میں اپنی شناخت بنانے میں کام یابی حاصل کی ہے۔ خانوادہ رضویہ کے بزرگوں اور اکابرین اہل سنت سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بلا کی موزونی ہے۔ شعر و سخن کا فطری ذوق پایا ہے۔ مبدا فیاض نے انہیں اخاذ طبیعت اور ذوق لطافت سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، سفر و حضر اور جلوت و خلوت میں ان کے وجود مسعود سے اشعار ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ کسی بھی موضوع، محفل، موقع اور مناسبت سے اشعار کی جھڑی لگا دینا ان کے لیے کار اسہل ہے۔ درس و تدریس، مطالعہ و ممارست، مقالہ نویسی و مضمون نگاری، نعت گوئی اور نظامت ان کا خاص شعبہ عمل ہے۔ بلکہ اپنی کھنک دار آواز، دل کش و انوکھے انداز، اور منفرد رنگ میں شعر خوانی کے سبب ان کا شمار ملک کے گنے چنے نقبا میں ہوتا ہے۔ عہد حاضر کے نوجوان شعرا میں شعر و ادب کے حوالے سے اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑی ہے۔ یہ ادب و فن سے شغف کا فیض ہے کہ اب تک تقریباً نصف درجن کتب ان کے خامہ زر نگار سے منظر عام پر آ کر ناقدین زبان و ادب سے داد و تحسین کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے تصنیف کردہ فکری گلدستوں میں گوہر

نایاب، شب جائے کہ من بودم، تضمین گوہر، ثنائے سرکارہے وظیفہ اور منظوم سوانح اعلیٰ حضرت بہ طور خاص قابل ذکر ہیں ۔ 'منظوم سوانح اعلیٰ حضرت' جو ان کی گراں قدر اور وقیع تصنیف ہے کی اشاعت پر مختلف ملی و ادبی تنظیموں کی جانب سے انہیں اعزازات و انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ محبوب گوہر جہان شعر و ادب کا ایک معروف نام ہے۔ وہ اس باب میں واقعی گوہر محبوب ہیں۔ انہوں نے عنفوان شباب میں نہایت قلیل عرصے میں اپنی رنگارنگ اور ذوق افزا شاعری سے علمی و ادبی اور عوامی سطح پر جس طرح پذیرائی حاصل کی ہے قابل صد رشک ہے۔ وہ شاہ راہِ حیات میں ہر گام مدحت رسول کی شمعیں فروزاں کرنے اور منزل در منزل فتح و کام رانی کے پرچم نصب کرنے میں مست مگن ہیں۔ میرے خیالات کی تشویق کے لیے معروف ناشر نعت محترم سید صبیح رحمانی کے یہ شذرات باصرہ نواز فرمائیں "۔۔ محبوب گوہر اسلام پوری ایک ایسے نوجوان خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں جو شعری روایات کی پاس داری کرتے ہوئے شاہ راہ عشق پر نئے چراغ روشن کرنے میں مصروف ہیں۔ حمد و نعت میں ان کا آہنگ منفرد و دل نواز ہے۔ میں ان کے نعتیہ کلام کا سرسری مطالعہ ہی کر سکا ہوں مگر اکثر مقامات پر مجھے محسوس ہوا کہ میں ان کا ہم نوا ہوں۔ سرشاری، محبت، وارفتگی، بے خودی اور عقیدہ و عقیدت کی روشنی ان کے ہر ہر شعر سے عیاں ہے۔ محبوب گوہر، سرور عالم ﷺ کے عشق بے پایاں کے نغمہ خواں ہیں۔ ان کے نغموں میں سوز، روشنی اور لطافت کی ایک ایسی فضا ہے جو دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔۔" (ثنائے سرکارہے وظیفہ)

ذیل میں بہ طور نمونہ ان کے چند اشعار خاطر نشین فرمائیں۔

ہر سمت گونجتی ہے مسلسل صدائے نعت
ذہنوں کو کر رہی ہے معطر فضائے نعت

شعر و ادب کا حسن نکھرتا چلا گیا
الفاظ جب چلے ہیں پہن کر قبائے نعت

خوش بوے نعت یہ کون آ کے چھڑک جاتا ہے
میرا ہر گوشہ احساس مہک جاتا ہے

ان کا گر نقشِ قدم سامنے موجود نہ ہو
آدمی جہل کے صحرا میں بھٹک جاتا ہے

نبی کی نعت خوانی ہو رہی ہے
منور زندگانی ہو رہی ہے

نبی کی زلف اطہر کی مہک سے
معطر رات رانی ہو رہی ہے

نسبت کے چراغوں میں اگر تیل نہیں ہے
سمجھو کہ اجالوں سے کوئی میل نہیں ہے

اے وقت کے فن کار ذرا سوچ سمجھ کر
یہ نعت پیمبر ہے کوئی کھیل نہیں ہے

نئی زمینِ سخن اختراع کرتے ہیں
اکٹھا نعتیہ فن کی متاع کرتے ہیں

نبی کا اسمِ مبارک وظیفہ لب ہے
اسی سے رنج و الم کا دفاع کرتے ہیں

تجلیات رضا سے ہمیشہ ہم گوہر
کشید شعر و سخن کی شعاع کرتے ہیں

مذکورہ بالا تمہیدی کلمات کے بعد آیئے جناب گوہر کے زیر نقد فکری نگینے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور اس کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کی بینائی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں!

ماشاء اللہ! سات اشعار پر مشتمل پورا کلام مرصع ہے۔ سادہ و سلیس اور شستہ انداز میں کہے جملہ اشعار سہل ممتنع کے

ملبوس سے مزین ہیں۔ اسلوبیاتی رچاؤ میں کلاسیکیت کی آمیزش دیدنی ہے۔ مضامین کی سطح پر نظر ڈالیں تو نعت حبیب لکھنے کی چاہ اور اس میں روح القدس کی تائید کی خواہش، علم وادراک کی شمعِ فروزاں کو جلوہ غار حرا سے تعبیر کرنا، خاک در رسول کو شفا اور دوا کا مترادف قرار دینا، اپنے ہم سائے سے حسن سلوک کی دعوت، کردار مصطفیٰ کا تذکرہ، اور اپنے فکر و فن کو امام نعت گویاں سیدی امام احمد رضا قدس سرہ کی فیض بخشی کا ثمرہ خیال کرنا اس قدر متنوع اور بھانت بھانت کے مضامین و موضوعات کی نظم کاری سے شاعر کی وسعت مطالعہ، فکری بلندی، اختراعی آہنگ اور ندرت خیال کا پتہ چلتا ہے۔ پورے کلام میں صاف شفاف لہجے کا اہتمام اور اظہار و ترسیل میں تکلف و تصنع سے گریز شاعر کی فطری سخن سازی اور ماہرانہ سحر کاری کا عندیہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں زور بیان اور فکر و خیال کو الفاظ کی قبا زیب تن کرانے میں کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جب کہ مکہ کی ضعیفہ کے حوالے سے جس واقعے کی طرف اشارا کرنے کی کوشش کی گئی ہے علماے محققین نے اسے بے اصل، موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے اس لیے ایسے واقعات کی عکاسی سے احتیاط برتنا انسب ہے۔ اس قدر اعلیٰ، عمدہ، دیدہ زیب اور ذوق افزا کاوش سے بزم محبت کی رونق افزائی پر ہم شاعر ہر دل عزیز محترم محوب گوہر صاحب کو تہ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ امید کہ آئندہ بھی اسی طرح اپنی فکری نگارشات سے نواز کر ہمیں تشکر کا موقع عطا کریں گے۔

گوہر صاحب جتنے خوب صورت ہیں ان کی شاعری اسی قدر خوب صورت ہوا کرتی ہے۔ نسل نو کی بھیڑ میں ان کی توانا اور مستحکم آواز ایک الگ سر اور لہجہ لیے ہوے نظر آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے زندگی کی مختصر بہاریں ہی دیکھی ہیں لیکن ان کی فکری اڑان اور شعری اٹھان ان کی عمر کے گراف سے اونچی دکھائی پڑتی ہے۔ معروف محقق اور قلم کار مفتی شمشاد حسین رضوی رقم طراز ہیں "۔ محبوب گوہر نئی نسل کے نوجوان نعت گو شاعر ہیں۔ میں نے ان کو دیکھا بھی ہے اور ان کے کلام کو سنا بھی ہے۔ مناسب انداز اور خوش گوار لب و لہجہ میں اشعار پڑھتے ہیں، ان کی شعری آواز میں وزن بھی ہے، سوز و ساز بھی ہے، جادوئی کیفیت بھی ہے اور دلوں کو جیتنے کا ہنر بھی ہے۔۔"(ثناے سرکار ہے وظیفہ، ص:32)

دعا ہے مولاے قدیر محترم گوہر صاحب کے فکر و فن اور علم و عمل میں مزید ترقی اور اثر آفرینی عطا فرمائے، انہیں ہر قدم تازہ دم رکھے اور زبان و قلم کی مہکار عام سے عام تر ہو۔ آمین

اخیر میں معروف نعت گو شاعر جناب مظفر وارثی مرحوم کے یہ چار مصرعے شاعر محبوب کے ذوق سخن اور حسن فن کی نذر کرتے ہوئے واع لیتے ہیں۔

ایک بے نام کو اعزاز نسب مل جائے
کاش مداح پیمبر کا لقب مل جائے
دے نہ قسطوں میں مظفر کو محبت اپنی
جس قدر اس کے مقدر میں ہے سب مل جائے

سخن تلاش

ابو محمد مظہر